ترقی پسند تحریک کی تاریخ

(۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۵ء تک)

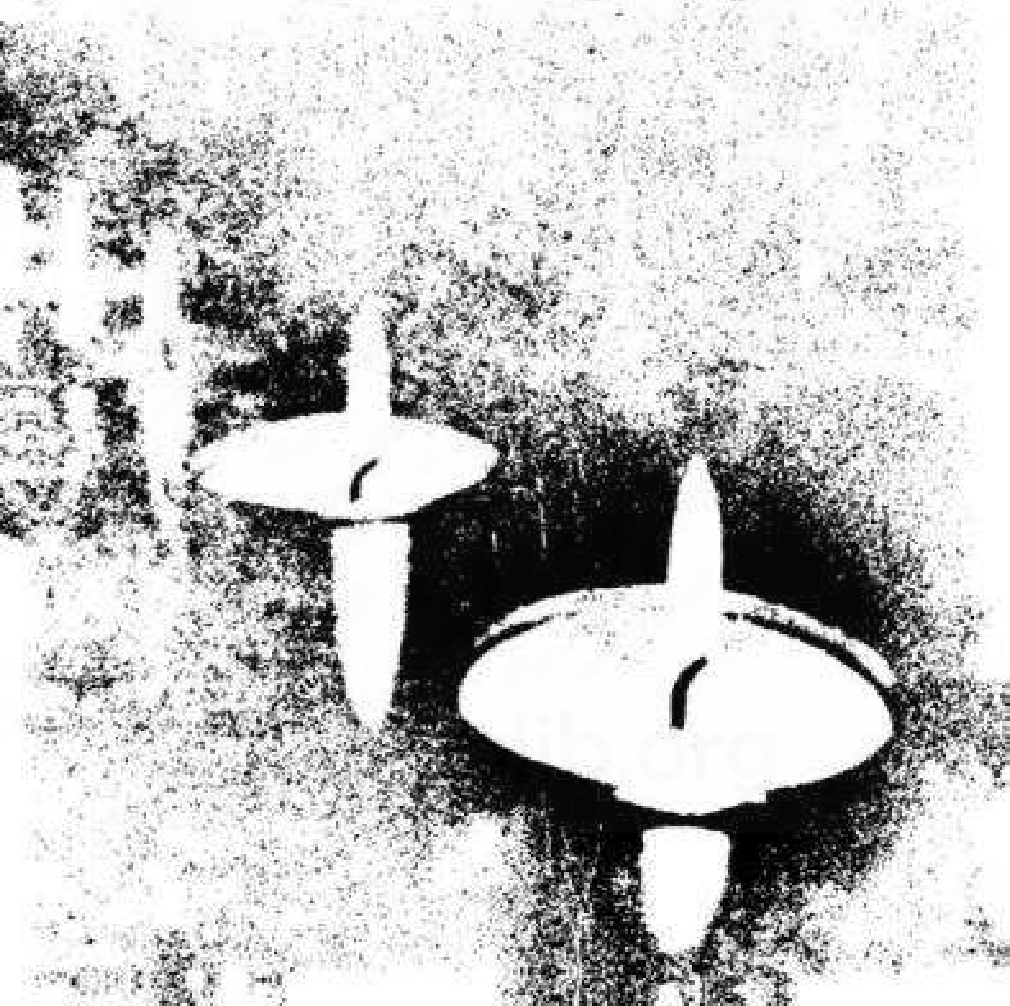

ترقی پسند تحریک کی تاریخ

(۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۵ء تک)

ڈاکٹر عبدالقیوم شمسی

maablib.org

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

طبع اول : ۲۰۱۰ء

تعداد اشاعت : ۳۰۰

کمپوزنگ : جاوید نظر، رحجان پبلیکیشنز، کریلی، الہ آباد۔

موبائل:9335489474

مطبع : پریم پرکاشن، الہ آباد

ناشر : ڈاکٹر عبدالقیوم شمسی

محلہ قصبیانہ (نئی بستی)، مچھلی شہر، جونپور۔

موبائل:9450612106, 9889177721

قیمت : ۳۰۰ روپئے

TARAQQUI PASAND TAHREEK KI TAREEKH

(1935 TO 1985)

BY

Dr. Abdul Qayoum Shamsi

ملنے کا پتہ

رحجان پبلیکیشنز، C-82 کریلی کالونی، الہ آباد۔

ادارۂ نیا سفر، ۶۸ مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔

عبدالقیوم شمسی، شعبۂ اردو، محمد حسن پی۔ جی۔ کالج، جونپور۔

انتساب

امی اور ابو

(جن کی تربیت سے آج میں اس قابل ہوا)

اور

اپنے چھوٹے بھائی

حافظ عبدالقادر شمسی مرحوم

کے نام

(تم کیا گئے، کہ خوشیاں چلی گئیں)

ع کون سی شب ہے جو رو رو کے نہیں کٹتی ہے

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

maablib.org

فہرست

	چند باتیں پروفیسر علی احمد فاطمی	7
	دیباچہ	12
باب اول:	ترقی پسند تحریک کا تشکیلی پس منظر	**19-44**
	ترقی پسند تحریک سے قبل عالمی صورت حال	19
	پیرس میں دانشوروں کا اجتماع اور انجمن کا قیام	25
	لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین (ہند) کا قیام	29
	لندن میں منظور اعلان نامہ	32
	ہندستان میں ترقی پسند تحریک کی شروعات	35
باب دوم:	کانفرنسیں اور ان کی کارگزاریاں	**45-258**
	پہلی کل ہند کانفرنس، لکھنؤ ۱۹۳۶ء	45

الہ آباد کانفرنس ۱۹۳۷ء	78
الہ آباد کانفرنس ۱۹۳۸ء	94
دوسری کل ہند کانفرنس، کلکتہ ۱۹۳۸ء	108
تیسری کل ہند کانفرنس، دہلی ۱۹۴۲ء	120
چوتھی کل ہند کانفرنس، بمبئی ۱۹۴۳ء	131
کل ہند کانفرنس (اردو) حیدرآباد ۱۹۴۵ء	139
بھوپال کانفرنس ۱۹۴۹ء	157
پانچویں کل ہند کانفرنس، بھیمڑی ۱۹۴۹ء	166
چھٹی کل ہند کانفرنس، دہلی ۱۹۵۳ء	183
ساتویں کل ہند کانفرنس، دہلی ۱۹۶۶ء	202
گیا کانفرنس ۱۹۷۵ء	210
دہلی کانفرنس ۱۹۷۳ء	217
گولڈن جوبلی کانفرنس، لندن ۱۹۸۵ء	225
باب سوم: تنقیدی تجزیہ	259-295

﴿ چند باتیں ﴾

بلا شک وشبہ ترقی پسند تحریک نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ پورے ہندستانی زبان وادب کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ کچھ لوگ علی گڈھ تحریک یا سرسید تحریک کو بھی بڑی تحریک کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک بھی انیسویں صدی کی بڑی تحریک تھی لیکن دونوں میں فرق ہے۔ علی گڈھ تحریک بنیادی طور پر سماجی تحریک تھی اسی ضمن میں اصلاحی واخلاقی بھی جس نے براہ راست شعروادب کو متاثر کیا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک ادبی وثقافتی تحریک تھی جس نے ملک ومعاشرہ کو متاثر کیا۔ دونوں ہی صورتوں میں ادب اور سماج کے گہرے رشتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

کچھ لوگ ترقی پسند تحریک کو علی گڈھ تحریک کی توسیع کہتے ہیں۔ جو لوگ تاریخی تسلسل اور ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں وہ لفظ توسیع سے اختلاف تو نہیں کرسکتے لیکن دونوں کے فرق کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ سرسید تحریک کا تعلق اشتراکیت واشتمالیت سے نہیں تھا۔ نچلے طبقہ کے عوام سے نہیں تھا۔ عورتوں سے بھی کوئی تعلق نہ تھا جو بعد میں تعلیم وتہذیب کے حوالے سے ترقی پسند تحریک نے پیدا کی۔ یہ ممکن بھی نہ تھا کیونکہ دونوں تحریکات کے درمیان زمانی بُعد، جدید علوم وفنون اور عالمی صورت حال مختلف تھی۔ سرسید نے کچھ انگریزی اور زیادہ وانگریزوں سے سیکھا ضرور تھا اور تہذیب الاخلاق بھی اسپکٹیٹر (Spectator) کے طور پر جاری کیا لیکن ان کا نظریہ قوم وملت تک محدود تھا۔ یہ ان کی نہیں ان کے عہد کی مجبوری تھی۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک کے بانی وسربراہ سجاد ظہیر کے غور وفکر کا سلسلہ قوم وملت سے شروع ضرور ہوتا ہے لیکن دیکھتے دیکھتے عالمیت تک پھیل جاتا ہے۔ گاندھی سے شروع ہو کر مارکس اور لینن تک پہنچتا ہے جن سے ساری دنیا کے ادیب ودانشور متاثر ہو رہے تھے۔

جن سے بعد میں لندن اور پیرس میں ملاقاتیں ہوئیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔اس کے بعد روماں رولاں، برٹنڈ رسل اور ٹیگور وغیرہ کا جنگ کے خلاف اعلان۔ ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب ۱۹۲۳ء میں روماں رولاں نے Declaration of Independance thought اور ۱۹۲۵ء میں Committe of action against war & facism قائم ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اسی کمیٹی کا اجلاس برلن میں ہوا جس میں نہرو بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں اسی کمیٹی کی ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں ہنری باربوس، روماں رولاں اور لوئی آراگوں کی کوششوں سے پیرس میں فاشزم کے خلاف کانفرنس ہوئی۔

یورپ میں ایک طالب علم کی زندگی گزارتے ہوئے باخبری اور دانشوری کے حوالے سے ان تمام عالمی سرگرمیوں کو سجاد ظہیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا اور جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ہونے والی ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں ملک راج آنند کے ساتھ وہ شریک ہوئے جس کا مقصد انسانیت کی بقا، کلچر کا تحفظ اور امن کا قیام تھا۔ ایلیا اہرن برگ کی نصیحت وہدایت نے تو ان کے ذہن کی دنیا بدل دی۔ افسانہ نگار و ناول نگار سجاد ظہیر کو یہ احساس ہوگیا کہ ایسی تخلیقات کے ذریعہ ایک تخلیق کار کی انفرادی تسلی وتشفی تو ہوسکتی ہے لیکن کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے انھوں نے ساری قوت وصلاحیت تحریک کے قیام پر صرف کی اور ساری زندگی اسی کے لئے وقف کردی۔

آفاقیت اور اشتراکیت کے حوالے سے سجاد ظہیر اور ان کی تحریک پر طرح طرح کے الزامات بھی لگے مثلاً :

تحریک بدیسی پودا تھی جو ہندستان کی زمین میں غلط طور پر لگایا گیا۔

تحریک کی آڑ میں سوشلزم اور کمیونزم کی تبلیغ ہے۔

یہ ادب کو جمالیات سے دور کرکے سیاست کے قریب کرنے کی غیر تخلیقی کوشش ہے۔

ماضی کے صالح ادب کی صالح روایات کو مسترد کرنے کی کوشش ہے۔

الزامات اور بھی تھے جسے وقت نے غلط اور بے معنی ثابت کر دیا۔ سجاد ظہیر، عبدالعلیم اور سردار جعفری وغیرہ نے بار بار یہ وضاحت کی کہ ترقی پسندی کا تعلق محض اشتراکیت سے نہیں ہے۔ انسان دوستی اور روشن خیالی سے ہے۔ اس کا اپنا صالح روایت سے گہرا رشتہ ہے۔ سجاد ظہیر نے ذکر حافظ اور سردار جعفری نے پیغمبران سخن جیسی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ درجنوں مضامین میں اس طرح کی کھلی بحثیں کی گئی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء کی پہلی دعوت پر پریم چند، عبدالحق، جوش، اقبال، ٹیگور، حسرت اور سروجنی نائڈو وغیرہ کھل کر ان نوجوانوں کا ساتھ نہ دیتے اور تحریک بزرگ و خورد کے یادگار فن پارے اور مختلف زبان وادب کے ناقابل فراموش کارنامے اپنے دامن میں سجا نہ پاتی۔

تحریک سے متعلق غلط فہمیاں کچھ تو جان بوجھ کر پیدا کی گئیں اور کچھ تو انجانے میں یا ناواقفیت کی بنیاد پر ہوئیں۔ ہوا یوں کہ ترقی پسند ادب کی تاریخ پر اور تحریک و تنظیم کی پہلی کانفرنس کے انتظام وانعقاد سے لے کر اس کے اعلانات بیانات وغیرہ کی تفصیل و ترتیب نہ کے برابر ملتی ہے۔ سجاد ظہیر کی کتاب روشنائی کو عام طور پر تحریک کی تاریخ کہا تو جاتا ہے لیکن وہ بھی ایک مختصر دور پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں واقعہ نگاری، خاکہ نگاری اور نظریاتی مباحث کچھ اس انداز سے داخل متن ہو گئے ہیں کہ تشکیر و تنظیم شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ علی سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب کا محاکمہ ہے تحریک کا محاسبہ نہیں۔ دوسری کتابیں ایک خاص نظریہ سے بلکہ مخالف نظریہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔

بہت پہلے جب علی سردار جعفری اور قمر رئیس باحیات تھے تو میں نے ان بزرگ ادیبوں سے عرض کیا تھا کہ تحریک و تنظیم کی تاریخ ریکارڈ ہونا چاہئے کہ کس کانفرنس میں کون سی اہم تجاویز پیش کی گئیں اور اس کے مینی فیسٹو کیا تھے۔ ان بزرگوں نے اس کمی کا احساس تو کیا لیکن الٹا یہ کام مجھ سے کرنے کو کہا۔ میں نے ایک مکمل کتاب ترقی پسند تحریک سفر در سفر تو

لکھ ڈالی لیکن یہ کام میں بھی نہ کر سکا جس کا مجھے احساس ہے۔ دراصل اپنے ذاتی مطالعہ، رسالہ اور ملازمت کی مصروفیات کے پیش نظر ایک عمدہ اور محنتی طالب علم کی تلاش تھی کہ جس سے ڈی فل. کے مقالہ کے لئے اس موضوع پر کام کروا سکوں۔ بالآخر کچھ انتظار کے بعد عبدالقیوم شمسی نام کے نوجوان کو اس موضوع پر مقالہ لکھنے کے لئے آمادہ کیا۔ مجھے یہ بات کافی محنت سے سمجھانی پڑی کہ اس مقالہ میں نظریاتی بحث کم کرنی ہے وہ صرف ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک یعنی پچاس برسوں میں ہونے والی تمام کانفرنسوں کی رپورٹ اور ریکارڈ کو جمع کرے اور اس کی تبدیلی اور ارتقاء کو پیش کرے۔ یہ کام تلاش بسیار اور عرق ریزی کا تھا۔ اور مجھے بیحد خوشی ہے کہ عبدالقیوم نے اس کام کو محنت اور سوجھ بوجھ سے کر ڈالا۔ اس نے لندن کے اعلان نامہ (۱۹۳۵ء) سے لے کر لندن کی گولڈن جوبلی کانفرنس (۱۹۸۵ء) کو احاطۂ تحریر و تحقیق میں لیا ہے۔ مختلف لائبریریوں سے کانفرنس کی رپورٹیں و دستاویز جمع کئے، رسائل کے اوراق کھنگالے، کتابیں پڑھیں، بزرگ و ممتاز ترقی پسند ادیبوں سے ملاقاتیں کیں، انٹرویوز کئے غرض کہ تمام طرح سے مواد کو فراہم کیا۔ سلیقہ سے ترتیب دیا۔ کچھ کمیاں رہ سکتی ہیں تاہم یہ اچھی بات ہے کہ یہ ترتیب اور پیشکش غیر جانب دارانہ اور ایماندارانہ ہے۔ عبدالقیوم مچھلی شہر (جونپور) کے ایک مذہبی گھرانے کے فرزند ہیں۔ اشتراکیت وغیرہ سے ان کی دلچسپی نہ کے برابر ہے بلکہ ابتدا ترقی پسندی کے بارے میں ان کی رائے مناسب و مثبت نہ تھی جیسا کہ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ یہ بات اس مقالے کے حق میں گئی۔ کم عمری کا سادہ اور معصوم ذہن اصل سچائی کی تلاش میں لگ گیا اور ایمانداری سے، پہلے اس نے ترقی پسندی کو سمجھا، کانفرنس کے اعلانات کا بغور مطالعہ کیا اور پوری سادگی اور دیانت داری سے ترتیب دیتا گیا اور نتائج بھی اخذ کرتا گیا جس کا اظہار وہ مقالہ کے آخری باب میں یوں کرتا ہے:

"انجمن ترقی پسند مصنفین نے ہندستانی سماج اور فکر و شعور

کو ایک نئی سمت دی۔ ایک نیا وژن دیا۔ ہمیں تحریک کے ان حسین پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جس کے زیر اثر ہمارا ادب ہماری زندگی سے جڑ سکا۔ اسی ادب نے عوام کو، باشعور قاری کو اچھے اور برے میں، افادی اور غیر افادی میں تمیز کرنا سکھایا اور اسی تحریک نے عوام کو اپنا حق پانے کے لئے، مظلوموں کے ظلم سے بچنے کے لئے صف آرا ہونے کی قوت بخشی۔"

کچھ لوگ ترقی پسند تحریک اور اس کے اصولوں سے آج بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ اختلاف کرنا ہر انسان کا جمہوری حق ہے۔ بشرطیکہ وہ قریب سے پڑھ کر اور سمجھ کر کرے۔ لیکن جہاں ایک طرف ایک زمانے میں ترقی پسند ہونا فیشن میں شامل ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ترقی پسندی پر لعن طعن کرنا بھی ایک فیشن ہو گیا۔ یہ مقالہ ایسے کچھ نافہم اور بے خبر لوگوں کے لئے بطور خاص روشنی اور رہنمائی کا کام کرے گا اور تحریک پر مزید کام کرنے والوں کی بھی مدد کرے گا۔ ایسا مجھے یقین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقالہ مختلف و منفرد نوعیت کا ہے۔ اس عمدہ اور بامقصد مقالہ لکھنے کے لئے میں اپنے عزیز شاگرد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ خراب لکھے جانے والے مقالوں کے اس دور میں یہ مقالہ اپنی محنت اور افادیت کے پیش نظر ادب کے بڑے حلقے میں قبول کیا جائے گا۔ یقین ہے کہ کشتی کا قلم رک نہیں جائے گا اور مستقبل میں وہ اس سے بھی اچھے مقالے لکھیں گے۔ میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

اکتوبر ۲۰۱۰ء

پروفیسر علی احمد فاطمی
صدر شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

﴿ دیباچہ ﴾

ترقی پسند تحریک، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب یہ ایسے الفاظ تھے جنھیں سن کر میں بددل ہو جایا کرتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ یہ وہ شجر ممنوعہ ہے جسے کھا کر میں گمراہی اور بد اخلاقی کا شکار ہو جاؤں گا۔ کیونکہ ترقی پسند ادب پر جو الزامات عام طور پر عائد کئے جاتے ہیں وہ ہیں فحاشیت اور اشتراکیت (بہ معنی لادینیت) کے۔ چونکہ انسانی مزاج ہے کہ وہ تساہلی اور کاہلی کے سبب ہوا میں گردش کرتے ہوئے خیالات کو ہی اپنا خیال تسلیم کر لیتا ہے اور یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ ہوا کس قدر زہر آلود ہے۔ تاہم ایک بات تھی جو مجھے ترقی پسند ادب کی طرف کھینچتی تھی اور وہ تھی اس تحریک کی بنیادی فکر۔ یعنی ادب "برائے ادب" نہیں بلکہ "برائے زندگی" ہو۔ ادب محض لطف و انبساط کے لئے ہی نہ ہو بلکہ سماجی اور معاشی زندگی کا ترجمان بھی ہو۔ میری طبیعت اس فلسفے سے کلی طور پر ہم آہنگ تھی کہ قدرت نے ہمیں جو شعور اور صلاحیت بخشا ہے اس کا استعمال انسانی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے تو اس کا حق ادا ہو۔ میرے نزدیک انسانی فلاح میں معاشرتی نظام، اقتصادی ضرورت، مذہبی زندگی، اخلاق و آداب اور محبت و اخوت بھی شامل ہیں۔ ظلم و جبر کی مخالفت اور مظلوموں کی حمایت کرنا، آزادی اور خوشحالی کا تصور کرنا اسی انسانی فلاح کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی خوبی نے مجھے ترقی پسند ادب کا مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا۔

مجھے اقبال کی فکر و شاعری عقیدت کی حد تک پسند تھی اور ہے۔ ایم. اے. کرتے وقت خیال تھا کہ اس عظیم شاعر کے پیغام کو بنیاد بنا کر تحقیقی کام کروں گا۔ اس میں بلاشک عقیدت کارفرما تھی۔ اسی درمیان میں اپنے استاد پروفیسر علی احمد فاطمی کے قریب آیا اور ان کی انسان دوستی، فراخ دلی اور روشن خیالی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کا تعلق انجمن

ترقی پسند مصنفین سے ہے وہ تنظیم و تحریک کے فعال رکن ہیں۔ میں ترقی پسند ادب کا مطالعہ شروع کر ہی چکا تھا اب انھیں کے کہنے پر اس تحریک پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا مقصد ترقی پسند تحریک کا قصیدہ پڑھنا نہیں ہے، اور نہ ہی پڑھ سکتا ہوں کہ یہ بالکل بے داغ نہیں۔ مگر اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ کسی انسان کے اچھے یا برے فعل اس کے ذاتی عمل ہوتے ہیں اس کا اطلاق اس کے خاندان، فرقے یا اس کے مذہب پر نہیں کیا جاسکتا۔

ترقی پسند ادب میں بہت ساری اچھائیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں، جس کا اعتراف خود اعتدال پسند و انصاف پرور ترقی پسند ادیبوں و شاعروں نے کیا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم 'جز' پر نظر ڈال کر 'کل' کو مسترد کر دیں۔ حق یہ ہے کہ ہم غلط کو اتنا ہی غلط کہیں جتنا کہ وہ ہے۔ مجھے ترقی پسندی سے عقیدت نہیں مگر پسند ضرور ہے۔ میری نظر میں اس تحریک کو رد کرنے والوں کو چاہئے تھا کہ وہ صرف اس کی خامیوں کو نہ گناتے بلکہ خود اپنی تحریر کو ان کمیوں سے پاک کر کے سماج و عوام کی مدد کرتے۔

میں نے اس تحقیقی کام کو بالکل معروضی نقطۂ نظر سے انجام دیا ہے۔ میں نے شروع میں ہی عرض کیا ہے کہ مجھے اس تحریک سے نہ ہی عقیدت ہے اور نہ ہی نفرت کہ دونوں ہی صورتیں انسان کو غیر جانب دار نہیں رہنے دیتیں۔ مقالہ کے نگراں (پروفیسر علی احمد فاطمی) کا سخت حکم تھا کہ میں بغیر کسی مروت اور دباؤ کے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہتے ہوئے حتی الامکان درست تجزیہ کروں۔ ہمارا کام ترقی پسند ادب پر نہیں بلکہ اس تحریک پر ہے جس کے زیر سایہ ترقی پسند ادب پروان چڑھا۔ اس تحریک کو لے کر زیادہ تر غلط فہمیاں اسی لئے ہیں کہ ہم 'جز' کو پڑھ کر 'کل' کو ذمہ دار سمجھ لیتے ہیں۔ اگر ایک ساتھ ہی 'کل' پر اور اس کے اغراض و مقاصد پر نظر ڈالیں تو شاید 'جز' دیرپا اور اثر انداز نہ ہو۔ میں نے اسی خیال کے تحت یہ کام آگے بڑھایا۔

درحقیقت ہمارے تحقیقی مقالے کا عنوان "ترقی پسند تحریک کے پچاس سال

۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۵ء تک'' تھا۔ میں نے اب اسے ترقی پسند تحریک کی تاریخ کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنی سہولت کے لئے اسے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ''ترقی پسند تحریک کا تشکیلی پس منظر'' ہے۔ اس میں عالمی جنگ کے بعد کے ایشیا و یورپ کے حالات، ہندستانی سماجی، سیاسی و معاشی حالات نیز ہندستان کی جنگ آزادی کی جدوجہد پر بحث کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کیونکر ترقی پسند تحریک کی ضرورت محسوس ہوئی اور کس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

دوسرا باب ''کانفرنسیں اور ان کی کارگزاریاں'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ ۱۹۳۶ء سے لے کر گولڈن جوبلی کانفرنس لندن ۱۹۸۵ء تک کی کانفرنسوں کی تفصیلی روداد ہے۔ چونکہ ہمارے مقالے کی حد بندی ۱۹۸۵ء تک تھی اس لئے دانستہ دلی میں ہونے والی ۱۹۸۶ء کی گولڈن جوبلی کانفرنس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا بھی اعتراف ہے کہ بہت سی شہری اور علاقائی کانفرنسوں کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ تلاش و تحقیق کا کام پوری ایمانداری سے کیا گیا مگر ان کی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔ خاص کر مئو کانفرنس کا معاملہ جو کہ چھٹی کل ہند کانفرنس کے بعد ہوئی اور سجاد ظہیر نے اس میں تحریک و تنظیم کی حد درجہ کمزوری کو دیکھتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اب ترقی پسند تحریک کا کام ختم ہوا۔ ممکن ہے آگے چل کر کچھ کانفرنسوں کی روداد تحقیق کرنے والوں کو حاصل ہو۔

تیسرے باب میں اس تحریک کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تحریک کے نشیب و فراز، اس کی خوبیوں اور خامیوں اور ادب و سماج پر پڑنے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بہر حال اس متنازعہ اور ملزم (نہ کہ مجرم) تحریک پر روشنی ڈالنے اور غیر جانب دارانہ حقائق تلاش کرنے اور اس کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مجھے متعدد لائبریریوں کی گرد صاف کرنی پڑی۔ اس ضمن میں الہ آباد یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کے علاوہ میں نے

خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی لائبریری، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ہیڈ آفس کی لائبریری، امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ اور اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کی لائبریری سے متعدد فائلیں، رسالے اور دستاویز حاصل کئے۔ جن میں شاہراہ، نیا ادب، گفتگو، نیا ادب اور کلیم، سویرا، فن کار اور حیات وغیرہ رسالوں اور جریدوں نے کافی مواد فراہم کیا۔ اہل علم حضرات سے، خاص کر ان سے جنھوں نے تحریک کے عروج و زوال کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ تنظیم و تحریک میں شریک بھی رہے ہیں، رجوع کیا۔ کبھی خط و کتابت کے ذریعہ تو کبھی بذات خود۔ لیکن اس صحرا میں ایک قدم بھی نہ چل پاتا اگر استاد محترم کی فکر و نظر اور محبت و شفقت کا سہارا نہ ملتا۔ انھوں نے مواد کی دستیابی میں ہماری حتی المقدور مدد کی۔

اس کام میں جس دوسری شخصیت نے میری سب سے زیادہ مدد فرمائی اور رہنمائی کی وہ اردو ادب کے مایہ ناز ادیب و ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب ہیں۔ پروفیسر سید محمد عقیل کا تعلق چونکہ خود ترقی پسند تحریک سے رہا ہے اور انھوں نے اس کی فکری اور عملی کاوشوں میں حصہ لیا ہے اور نشیب و فراز کو دیکھا ہے اس لئے مجھے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے ان سے بھرپور فکری غذا ملی۔ پروفیسر سید محمد عقیل جو نہ کہ ہندستان میں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی علمیت، شرافت اور قلندرانہ مزاج کے لئے جانے جاتے ہیں ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے۔

میں پروفیسر قمر رئیس صاحب کا بیحد احسان مند ہوں کہ انھوں نے بھی اس مقالے کے لئے میری بھرپور مدد کی اس سلسلہ میں میری ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئی تھیں اور انھوں نے ہر دفعہ تحریک کے پس منظر، تحریک کی ضرورت اور اس کی افادیت پر بغیر کسی مصلحت کے باتیں کیں۔ تحریک و تنظیم کی خامیوں کا بھی ذکر کیا۔ افسوس آج وہ ہمارے

درمیان موجود نہیں۔

اس سلسلہ میں میری ملاقات جناب عابد سہیل صاحب سے بھی ہوئی۔ میں ان کی محبت اور انسان دوستی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باوجود اجنبی ہونے کے انھوں نے مجھے دو دنوں تک اپنا مہمان رکھا اور بڑے خلوص ومحبت کے ساتھ میرے سوالات کے جوابات دیئے، بہت ساری نئی باتیں بتائیں اور بھیمڑی کانفرنس سے متعلق کچھ دستاویز بھی دیئے جس میں ایک سید محمد مہدی کا خط بھی ہے۔ عابد سہیل صاحب کی یہ نوازشیں مجھے تاعمر یاد رہیں گی۔

اس کے علاوہ پروفیسر محمد حسن، رفعت سروش، عارف نقوی وغیرہ سے بھی تحریک کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ میں نے یہ تحقیقی مقالہ الہ آباد یونیورسٹی میں مکمل کیا، وہاں کے بزرگ استاد پروفیسر سید فضل امام صاحب، پروفیسر عبدالحامد صاحب، پروفیسر عبدالقادر جعفری صاحب (شعبۂ عربی)، پروفیسر نوشابہ سردار صاحبہ اور ڈاکٹر شبنم حمید صاحبہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان سب نے موقع بہ موقع میری رہنمائی کی۔

میں اس موقع پر اپنے ماں باپ کو کس طرح نظر انداز کرسکتا ہوں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ چھوٹی سی ملازمت میں حسن خوبی سے گھر کا خرچ چلانا اور بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا معمولی بات نہیں، مگر ہمارے والدین نے اسے حسن اسلوبی سے نبھایا۔ انھوں نے ہماری ہر طرح سے مدد کی۔ آج انھیں کی محبت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں یہ کام مکمل کرسکا۔ خدا ان کی ہر مرادیں اور خواہشیں بروئے کار لائے۔ ایک اولاد اپنے ماں باپ کے لئے اور کیا کہہ سکتا ہے، کیا دے سکتا ہے۔

محمد حسن پی۔ جی۔ کالج کے مشفق ومحترم پرنسپل ڈاکٹر عبدالقادر خاں صاحب کا بھی بیحد شکر گزار ہوں کہ انھیں کے لطف وکرم کی وجہ سے میں تدریسی مصروفیت کے باوجود اپنے مقالے کو کتابی شکل میں پیش کرسکا۔ ساتھ ہی کالج کے دیگر تمام اساتذہ کا بھی شکر گزار ہوں

کہ انھوں نے بھی ہماری حتی الامکان مدد و رہنمائی کی۔

اپنے دوستوں میں ڈاکٹر عزیزہ بانو، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر نغمہ پروین، ڈاکٹر احمد طارق، ڈاکٹر حسین جیلانی، سبط حسن، ابوبکر خان اور ممتاز انور وغیرہ کا بھی شکریہ کہ ان کے دوستانہ مشوروں نے ہمارے کام کو آسان بنایا۔

ڈاکٹر تنویر احمد، انیس اختر، اصغر علی، محمد زبیر، عبدالقدوس اور ڈاکٹر کہکشاں عرفان تو شاملِ حال رہے ہیں ان کا شکریہ ادا کر کے میں لفظ دوستی کے معنی کو بے جان نہیں کرنا چاہتا۔

جناب جاوید نظر صاحب اس مقالے کے کمپوزر ہیں جنھوں نے بڑی محنت اور ذمہ داری سے یہ کام انجام دیا اور اس تحقیقی مقالے کو قابل دید بنایا۔ خدا ان کی محبت تادم حیات قائم رکھے۔

استاد محترم پروفیسر علی احمد فاطمی کا شکریہ ادا کرنا ان کے احسان کو کم کرنا ہوگا۔ بس اتنا عرض کروں گا کہ جو کچھ بھی یہاں موجود ہے (سوائے خامیوں کے) سب انھیں کی محبت، شفقت اور رہنمائی کا ثمرہ ہے۔

بہر حال یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ اس سے ترقی پسند تحریک کو سمجھنے میں کچھ مدد ضرور ملے گی۔

اکتوبر ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر عبدالقیوم شمسی
شعبۂ اردو
محمد حسن پوسٹ گریجویٹ کالج
جونپور

ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان اجزاء کو سمجھنا ہوگا، جو ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تشکیل میں کارفرما تھے۔ جب تک ہم ان حالات کو نہ سمجھ لیں، جن کے سبب اس تحریک کا آغاز ہوا، جب تک یہ نہ جان لیں کہ وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جن کے زیرِ اثر پوری دنیا کے ذی شعور لوگ ایک انجمن کی شکل میں متحد ہو رہے تھے، جب تک یہ نہ دیکھ لیں کہ انجمن کی بنیاد سے قبل عالمی، سماجی اور سیاسی صورتِ حال کیا تھی۔ تب تک ہم اس تحریک کے ساتھ اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ حق بجانب نہیں ہو سکتے۔

maablib.org

باب اول

ترقی پسند تحریک سے قبل عالمی صورتِ حال

ترقی پسند تحریک ایک ایسا موضوع ہے جو ابھی تک مکمل و مناسب تعریف و تشریح سے محروم ہے۔ اس تحریک کو اکثر کمیونزم سے جوڑ کر دیکھا جاتا رہا ہے۔ ترقی پسند مصنف کو کمیونسٹ پارٹی کا ایجنٹ اور انجمن کو پارٹی کی ایک شاخ سمجھا گیا۔ اس تحریک سے منسلک ادیب و شاعر کو مذہب، روایت، سماج اور قدیم ادب کا منکر تصور کیا جانے لگا۔ ان پر یہ الزام ٹھہرا کہ ترقی پسند مخرب اخلاق ہیں اور ادب کی لطافت و حسن کو باغیانہ تیور سے کھردرا اور زخمی کر دیتے ہیں۔ وہ سرخ گلاب کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ وہ دیدہ زیب، نازک، شگفتہ اور روح افزا ہے بلکہ اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں انھیں اشتراکی رنگ جھلکتا ہے۔ انقلاب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ کلی طور پر سچ نہیں بلکہ اس تحریک کے مقصد پر غیر معتدل بحث اور تنقیص ہے، جس کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔ تحریک کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان اجزاء کو سمجھنا ہوگا، جو ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تشکیل میں کارفرما تھے۔ جب تک ہم ان حالات کو نہ سمجھ لیں، جن کے سبب اس تحریک کا آغاز ہوا، جب تک یہ نہ جان لیں کہ وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جن کے زیر اثر پوری دنیا کے

ذی شعور لوگ ایک انجمن کی شکل میں متحد ہو رہے تھے، جب تک یہ نہ دیکھ لیں کہ انجمن کی بنیاد سے قبل عالمی، سماجی اور سیاسی صورت حال کیا تھی۔ تب تک ہم اس تحریک کے ساتھ اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ حق بجانب نہیں ہو سکتے۔

یہ سچ ہے کہ انجمن کے بڑے حصے نے مارکسزم کو اپنا آلۂ اظہار بنایا اور ادب کو مقصدی اور افادی تاج پہنانے کی فکر میں اس کے فن و اسلوب کے زریں لباس کو کہیں کہیں سے چاک بھی کیا۔ مگر یہ باتیں بھی ترقی پسند مصنفین پر صادق نہیں آتیں (حالانکہ سارے کمیونسٹ ادیب بھی ایسے نہ تھے)۔ سبھی ترقی پسند نہ تو کمیونسٹ تھے اور نہ ہی فن سے بے اعتنا۔ جہاں تک کمیونزم یا مارکسزم کے آلۂ کار کا سوال ہے تو یہ وقت کی اشد ضرورت تھی کہ مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال دانشور، ادیب و شاعر اور فنکار ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ایک مقصد کے لیے قلم چلائیں، ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں، جدوجہد کریں اور عوام کی آواز میں آواز ملائیں۔ کیونکہ انیسویں صدی کے آخری ربع سے لے کر بیسویں صدی کے پہلے ربع کے درمیان کا وقت بنی نوع انسان کے لئے قیامت صغریٰ تھا۔ تمام عالم میں عذاب کی سی کیفیت تھی۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر جگہ کی عوام مفلوک الحال تھی۔ ان کا وقت بھوک اور افلاس کو برداشت کرنے میں کٹتا تھا۔ پیٹ کی آگ رو رو کر بجھائی جاتی تھی۔ اگر یورپ میں فاشزم کا قہر تھا تو روس میں جار کا اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کا۔ پھر پہلی جنگ عظیم۔ عالمی جنگ جس نے انسان کو درندہ بنا دیا، اقتصادی بحران نے کمر توڑ دی تھی۔ ایسے میں امیر اپنی حویلی میں مست تھا تو غریب جھونپڑے یا فٹ پاتھ پر پست۔ اگر کچھ دولت مندوں کو ان بھوکے پیاسوں یا مظلوموں سے ہمدردی تھی بھی تو وہ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اور سوال یا احتجاج کی شکل میں حکومت تک نہ پہنچ سکی۔ اور نہ ہی پہنچ سکتی تھی کیونکہ انھیں خود ہی لٹ جانے کا خوف تھا۔ ایسے میں یہ خدمت انسانی کا کام ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں اور دانشوروں کے ذمہ تھا، جو سرمایہ میں دولت نہیں بلکہ علم و آگہی رکھتے ہیں،

ذہن وشعور رکھتے ہیں۔ انھیں لٹنے کا خوف بھی نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ آزاد خیال اور غیرت مند ہوتے ہیں۔ لیکن ان اوصاف کے باوجود بھی وہ آخر ہیں انسان ہی، فرشتہ نہیں۔ اس لئے کسی ایک ایسے نظریہ کا ہونا بہت ضروری تھا جس کا ایک سرا مظلوموں اور ضرورت مندوں سے ملتا ہو اور دوسرا اتنا چکنا ہو کہ کسی کا عقیدہ مجروح نہ کر سکے۔ اور یہ عمل کسی مخصوص مذہب کے پرچم تلے ناممکن تھا۔ اس لئے اس بحرانی دور میں مارکسزم یا اشتراکیت کا نظریہ سب سے بہتر نظریہ ثابت ہوا۔ (کیونکہ اشتراکیت کوئی مذہب نہیں، ایک فکر ہے) جوکہ مساوات، حق اور انسانی فلاح کے لئے لڑ رہا تھا۔ پھر اشتراکیت کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ اگر قابل اعتراض ہے تو اشتراکیت کے بانیوں کا مقلد ہونا۔ ورنہ کون سا مذہب ہے جو کچھ رد و بدل کے ساتھ انسانی مساوات، اخوت یا محبت اور مظلوموں کی حمایت میں آواز بلند کرنے کی بات نہیں کرتا۔

لفظ فاشزم اگرچہ مخصوص معنی میں جزیرہ اٹلی میں مسولینی کے ظلم و جبر کا ترجمان ہے مگر آگے چل کر اس کا استعمال علامتی ہو گیا۔ دنیا کے ہر اس ملک یا خطے میں جہاں پر ظلم و تشدد وہاں کے برسراقتدار لوگوں کی نگرانی میں منظم طریقہ سے کیا جائے اسے فاشزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے امیری غریبی کی تفریق ہو سکتی ہے، طبقاتی کشمکش ہو سکتی ہے، نسلی اقتدار ہو سکتا ہے یا پھر تہذیبی اور مذہبی تنگ نظری۔ بہر حال منصوبہ بند ظلم و قہر فاشزم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد دنیا کی جو حالت ہوئی اس میں ہر جگہ فاشزم کی کالی پرچھائیں نظر آنے لگی۔

۲۸ر جون ۱۹۱۴ء کو آسٹریا (Austria) کے ولی عہد "آرک ڈیوک فرانس فرڈی ننڈ" کو بوسنیا (Bosniya) کے شہر سراجیو میں قتل کر دیا گیا۔ اس معاملے نے طول پکڑا اور آسٹریا نے اس کی ذمہ داری سربیہ (Surbiya) پر ڈالی۔ دیگر کئی ممالک کے احتجاج کے باوجود آسٹریا نے ٹھیک ایک ماہ بعد ۲۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو سربیہ پر حملہ کر دیا۔ یہ

عالمی جنگ کی شروعات تھی۔ یورپ کے ممالک میں پہلے ہی سے گروپ بندی تھی اور دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف خلش تھی۔ ایسے میں اس حملے نے اپنی اپنی دشمنی نکالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے اس جنگ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا یورپ جنگ کا میدان بن گیا۔ روایت ہے کہ اس جنگ میں چھ کروڑ پچاس لاکھ فوجیوں نے حصہ لیا اور تقریباً بیاسی لاکھ سپاہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ دو کروڑ کے آس پاس زخمی ہوئے اور اس قتل و خون اور مار کاٹ میں جو عوام ہلاک ہوئی وہ شمار کے پرے ہے۔ اس کے علاوہ قریب قریب ایک ہزار ارب روپئے کا مالی نقصان ہوا۔ صنعت و حرفت برباد ہو گئی اور زراعت پامال ہوئی۔ اس سے غریبی اور بھوک مری نے زور پکڑا۔ بیماریوں نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ کسان اور مزدور طبقہ بھوکوں مرنے لگا۔ حکومتیں اپنی عیش پرورانہ زندگی میں مست رہیں۔ سرمایہ دار، غریبوں کو جانور سمجھتے تھے، ایسے میں بغاوت فطری تھی اور انقلاب ضروری تھا۔

انقلاب کی بہترین شکل ۱۹۱۷ء میں روسی عوام کا انقلاب تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے امریکہ اور فرانس میں انقلاب آ چکے تھے مگر روس کا انقلاب کئی معنوں میں اہم ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک منظم فلسفے کے تحت تھا۔ جسے مارکس نے پیش کیا اور لینن نے عملی جامہ پہنایا۔ دوسرے یہ کہ یہ عوام کا انقلاب تھا جس میں غریبوں، مزدوروں، بیکسوں اور بیروزگاروں کی بھرمار تھی اور جنھوں نے متحد ہو کر ''جار'' کا تختہ پلٹ دیا تھا۔ ''جار'' روس کے حاکموں کا لقب تھا۔ مگر اس وقت کا روسی جار انتہا درجہ خود پرست، عیش پرست اور جابر انسان تھا۔ ۲۲ رجنوری ۱۹۰۵ء کو جو کہ اتوار کا دن تھا، بھوکی، کمزور اور لاچار عوام جس کی تعداد غالباً ڈیڑھ لاکھ تھی ایک بہادر پادری ''گپو'' (Gappon) کی قیادت میں جار کے سامنے مظاہرہ کرنے گئے۔ ان کا ارادہ پر امن طریقے سے احتجاج درج کرانے اور اپنی بات رکھنے کا تھا، مگر سپاہیوں نے ان پر گولیاں برسا دیں۔ جس سے ۱۳۰ لوگ ہلاک ہو گئے۔ تاریخ میں

یہ واقعہ ''خونی اتوار'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس قتل عام نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ابھی تک لوگ بیکاری اور مفلوکی کو اپنا مقدر مان کر جی رہے تھے۔ مگر اس واقعے سے انھیں لگا کہ اب ان کی اور ان کے بچوں کی موت بھوک سے نہیں بلکہ ظلم وتشدد سے ہوگی۔ روس میں اشتراکیت کا نظریہ رفتہ رفتہ مقبول ہوتا جا رہا تھا جو کہ ظلم، آمریت اور سرمایہ داری کے خلاف تھا اور مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کو اپنا ساتھی مانتا تھا۔ انھیں منظم کرنا چاہتا تھا اور ان کے حق کی حمایت کی بات کرتا تھا۔ عوام اس سے متاثر ہونے لگی کہ اب سب لڑنا چاہتے تھے اپنی غریبی سے، بھوک سے اور ظلم سے۔ ابھی تک سب منتشر تھے لیکن اب منظم اور متحد ہونا چاہتے تھے اور دھیرے دھیرے یہ چنگاری ۷ رمارچ ۱۹۱۷ء کو جوالامکھی بن کر پھوٹ پڑی۔

غریبی، بیکاری اور ظالم حکومت سے تنگ آکر ۷ رمارچ ۱۹۱۷ء کو غیر معمولی سردی کے باوجود بھوکے اور غریب کسان اور مزدور پیٹروگراڈ کی سڑکوں پر اتر آئے اور دوکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ جار کے رویوں سے ناراض پولس نے بھی حکم کے باوجود گولی چلانے سے انکار کر دیا (اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کتنی بدحال رہی ہوگی اور حالات کتنے بدتر رہے ہوں گے)۔ کپڑا مل کی عورتوں نے بھی ہڑتال کر دی، اگلے دن مرد بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ سب کی ایک ہی مانگ تھی اور ایک ہی نعرہ تھا ''روٹی دو، روٹی دو'' اور ''ظالمانہ حکومت ختم کرو''۔ ان سب کے ساتھ غیر مطمئن فوجی ٹکڑیاں بھی آکر ملنے لگیں اور جار کی طاقت چھین کر ایک غیر مستحکم سرکار بنا دی گئی۔

اس نئی غیر مستحکم سرکار میں اندرونی اختلاف تھا۔ کچھ دنوں بعد عوامی سویت اور مذکور سرکار میں بھی اختلاف ہو گیا۔ ''بولشیوک'' پارٹی نے جس کا روح رواں لینن تھا اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور ۷-۶ رنومبر ۱۹۱۷ء کی رات ایک اور انقلاب برپا کر دیا۔ غیر مستحکم سرکار کو زیر کر کے ایک نیا نظام بنایا گیا جس میں نہ حاکم تھا اور نہ محکوم۔ نہ ظالم اور نہ مظلوم۔

عالمی جنگ کی شروعات تھی۔ یورپ کے ممالک میں پہلے ہی سے گروپ بندی تھی اور دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف خلش تھی۔ ایسے میں اس حملے نے اپنی اپنی دشمنی نکالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے اس جنگ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا یورپ جنگ کا میدان بن گیا۔ روایت ہے کہ اس جنگ میں چھ کروڑ پچاس لاکھ فوجیوں نے حصہ لیا اور تقریباً بیاسی لاکھ سپاہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ دو کروڑ کے آس پاس زخمی ہوئے اور اس قتل و خون اور مار کاٹ میں جو عوام ہلاک ہوئی وہ شمار کے پرے ہے۔ اس کے علاوہ قریب قریب ایک ہزار ارب روپئے کا مالی نقصان ہوا۔ صنعت و حرفت برباد ہوگئی اور زراعت پامال ہوئی۔ اس سے غریبی اور بھوک مری نے زور پکڑا۔ بیماریوں نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ کسان اور مزدور طبقہ بھوکوں مرنے لگا۔ حکومتیں اپنی عیش پروارانہ زندگی میں مست رہیں۔ سرمایہ دار، غریبوں کو جانور سمجھتے تھے، ایسے میں بغاوت فطری تھی اور انقلاب ضروری تھا۔

انقلاب کی بہترین شکل ۱۹۱۷ء میں روسی عوام کا انقلاب تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے امریکہ اور فرانس میں انقلاب آچکے تھے مگر روس کا انقلاب کئی معنوں میں اہم ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک منظم فلسفے کے تحت تھا۔ جسے مارکس نے پیش کیا اور لینن نے عملی جامہ پہنایا۔ دوسرے یہ کہ یہ عوام کا انقلاب تھا جس میں غریبوں، مزدوروں، بیکسوں اور بیروزگاروں کی بھرمار تھی اور جنھوں نے متحد ہو کر ''جار'' کا تختہ پلٹ دیا تھا۔ ''جار'' روس کے حاکموں کا لقب تھا۔ مگر اس وقت کا روسی جار انتہا درجہ خود پرست، عیش پرست اور جابر انسان تھا۔ ۲۲ رجنوری ۱۹۰۵ء کو جو کہ اتوار کا دن تھا، بھوکی، کمزور اور لاچار عوام جس کی تعداد غالباً ڈیڑھ لاکھ تھی ایک بہادر پادری ''گیپو'' (Gappon) کی قیادت میں جار کے سامنے مظاہرہ کرنے گئے۔ ان کا ارادہ پر امن طریقے سے احتجاج درج کرانے اور اپنی بات رکھنے کا تھا، مگر سپاہیوں نے ان پر گولیاں برسا دیں جس سے ۱۳۰ لوگ ہلاک ہو گئے۔ تاریخ میں

یہ واقعہ "خونی اتوار" کے نام سے مشہور ہے۔

اس قتل عام نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ابھی تک لوگ بیکاری اور مفلوکی کو اپنا مقدر مان کر جی رہے تھے۔ مگر اس واقعے سے انھیں لگا کہ اب ان کی اور ان کے بچوں کی موت بھوک سے نہیں بلکہ ظلم و تشدد سے ہوگی۔ روس میں اشتراکیت کا نظریہ رفتہ رفتہ مقبول ہوتا جا رہا تھا جو کہ ظلم، آمریت اور سرمایہ داری کے خلاف تھا اور مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کو اپنا ساتھی مانتا تھا۔ انھیں منظم کرنا چاہتا تھا اور ان کے حق کی حمایت کی بات کرتا تھا۔ عوام اس سے متاثر ہونے لگی کہ اب سب لڑنا چاہتے تھے اپنی غریبی سے، بھوک سے اور ظلم سے۔ ابھی تک سب منتشر تھے لیکن اب منظم اور متحد ہونا چاہتے تھے اور دھیرے دھیرے یہ چنگاری ۷ر مارچ ۱۹۱۷ء کو جوالا مکھی بن کر پھوٹ پڑی۔

غریبی، بیکاری اور ظالم حکومت سے تنگ آکر ۷ر مارچ ۱۹۱۷ء کو غیر معمولی سردی کے باوجود بھوکے اور غریب کسان اور مزدور پیٹرو گراڈ کی سڑکوں پر اتر آئے اور دوکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ زار کے رویوں سے ناراض پولس نے بھی حکم کے باوجود گولی چلانے سے انکار کر دیا (اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کتنی بدحال رہی ہوگی اور حالات کتنے بدتر رہے ہوں گے)۔ کپڑا مل کی عورتوں نے بھی ہڑتال کر دی، اگلے دن مرد بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ سب کی ایک ہی مانگ تھی اور ایک ہی نعرہ تھا "روٹی دو، روٹی دو" اور "ظالمانہ حکومت ختم کرو"۔ ان سب کے ساتھ غیر مطمئن فوجی ٹکڑیاں بھی آ کر ملنے لگیں اور زار کی طاقت چھین کر ایک غیر مستحکم سرکار بنا دی گئی۔

اس نئی غیر مستحکم سرکار میں اندرونی اختلاف تھا۔ کچھ دنوں بعد عوامی سویت اور مذکور سرکار میں بھی اختلاف ہو گیا۔ "بولشیوک" پارٹی نے جس کا روح رواں لینن تھا اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور ۷-۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کی رات ایک اور انقلاب برپا کر دیا۔ غیر مستحکم سرکار کو زیر کر کے ایک نیا نظام بنایا گیا جس میں نہ حاکم تھا اور نہ محکوم۔ نہ ظالم اور نہ مظلوم۔

ہم اسی نظام کو اشتراکیت کہتے ہیں۔

کم و بیش پوری دنیا پر ظلم کی یہی کالی سیاہی چڑھی ہوئی تھی جو روس میں تھی۔ تہذیب و تمدن، اخلاقیات و سماجی قدریں اور انسانی آزادی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ روس میں لینن کی قیادت میں انقلاب لا دیا گیا مگر ضروری نہیں تھا کہ یورپ کے اور ممالک ایسا کر سکتے۔ فاشسٹ طاقتوں نے اب اور جابرانہ شکل اختیار کر لیا۔ حق گوئی اور بے باکی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس سے بغاوت کرنے والے پر سرِ عام کوڑے برسائے جاتے۔ ادیب و شاعر و سائنسداں اور فلسفی جلاوطن کئے جانے لگے۔ سرمایہ دار اپنے نوکروں پر اور زمیندار اپنے کسانوں پر پہلے سے زیادہ ظلم کرنے لگے۔ ایسے میں اشتراکی نظریہ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور اہل شعور یہ سمجھنے لگے تھے اگر موجودہ دور میں اس پریشانی اور مہلک بیماری سے نجات پانا ہے تو سب کو اسی نظریہ کا ساتھ دینا ہوگا۔ آپس میں اتحاد پیدا کر کے مظلوموں، غریبوں اور بے بسوں کی مدد کرنا ہوگا۔ ادیب یا دانشور صرف وہی نہیں جو چند صفحات لکھ کر اپنی کتاب شائع کروائے یا علم کی روشنی میں منصوبہ بندی کر کے خیالی دنیا پیدا کرے بلکہ اس سے الگ بھی اس کی کچھ علامتیں ہونی چاہئیں اور ہوتی بھی ہیں۔ ان سے تقاضا ہونا چاہئے کہ ان کا علم، ان کا فن محض کتابوں کی زینت نہ ہوں بلکہ وہ سماج، تہذیب اور انسانیت کی زینت بنے، ان کے کام آئے۔ پوری دنیا کے ادیب اس کام کے لئے فکر مند ہو رہے تھے اور اسی ضرورت کے تحت انجمنیں بننے لگیں اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ ایسے میں مختلف النظریہ لوگوں کا ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا بغیر اشتراکیت کے مشکل تھا۔ (خاص کر اس بحرانی دور کی بات ہو رہی ہے) لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ جس نے اشتراکیت نہیں اپنائی وہ ترقی پسند نہیں تھا۔ ترقی پسندی تو روشن خیالی کی ہم پلہ ہے۔ یہ ہر دور میں رہی ہے اور رہے گی۔ پیرس میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس اور لندن میں تشکیل پا کر پورے ہندوستان کو شاداب کرنے والی انجمن ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' اسی ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔

پیرس میں دانشوروں کا اجتماع

اور

’انجمن بین الاقوامی مصنفین‘ کا قیام

یوں تو دنیا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی تکلیف دہ اور غم آلود فضا میں سانس لے رہی تھی، فاشزم کے حملے نے اسے اور کرب ناک بنا دیا۔ قوت پرست اور سرمایہ پرست طاقتوں نے تہذیبی اور سماجی قدروں کو پامال کرنا شروع کر دیا جس سے حریت پسند اور حق گو لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ ایسے میں دانشوروں نے (جس میں ادیب، آرٹسٹ، فنکار اور شاعر غرضکہ ہر اہل شعور شامل تھا) یہ محسوس کیا کہ ان کا علم و ہنر تب تک کسی وقعت کا حامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ انسانی فلاح و بہبود کے کام نہ آئے۔ اگر انسان ہی نہ رہا، خوشیاں ہی نہ رہیں تو یہ فن، یہ شاعری اور یہ آرٹ کس کے لئے، یہ شعور کس کے لئے۔ یہ بھی لوگ اپنے اندر ایک بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ وہ قدرت کے دیئے ہوئے عطیے (شعور، دماغ اور ہنر) سے لوگوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے۔ یورپ میں ارباب حکومت

نے لوگوں کی زبان پر پابندی عائد کر رکھی تھی، کسی کو حق بولنے کی آزادی نہیں تھی۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا احتجاج کرتے ہوئے مشہور مصنف 'روماں رولاں' کی پہل پر اظہار خیال کی آزادی کے لئے ایک اپیل شائع کی گئی جس پر روماں رولاں کے علاوہ میکسم گورکی، ہنری باربوس، برٹنڈ رسل، رابندر ناتھ ٹیگور اور اے۔ کمار سوامی کے دستخط تھے۔[1] فاشزم اور سامراج کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے بروسلیس میں فروری ۱۹۲۷ء میں ایک بین الاقوامی کانگریس ہوئی جس میں ہندوستان کی طرف سے جواہر لال نہرو شریک ہوئے اور نہ صرف شریک ہوئے بلکہ صدارتی مجلس میں بھی تھے۔[2] اس کانگریس میں سرمایہ داری کے خلاف، مزدوروں کے استحصال کے خلاف، ظلم اور جبر کے خلاف تجاویز پاس کی گئی تھیں۔ بین الاقوامی سطح پر چل رہی ان کوششوں میں ایک اہم واقعہ اس وقت جڑ گیا جب ۱۹۳۴ء میں روس میں سویت مصنفین کی کانگریس بلائی گئی۔ یہ باقاعدہ طور پر روسی ادیبوں کی پہلی کانگریس تھی۔ جس میں بہت سارے روسی ادیب شامل ہوئے تھے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کانگریس میں دوسرے کئی ممالک کے ادیب و شاعر بھی شامل ہوئے تھے، جن میں آندرے مارلو، یاقوب قادری، لوئی آراگوں، رچرڈ بلاک، بریڈلے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کسی مجبوری سے شریک تو نہ ہو سکے مگر کانگریس کو اپنی منظوری اور حمایت دی جیسے روماں رولاں، آندرے مارلو، ہنری باربوس، برنارڈ شا، ہنری مان وغیرہ۔[3] اس کانگریس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک روسی رسالے نے لکھا:

> "جب اس کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پوری روسی عوام ادب کے سوال پر ہی اپنا ذہن مرکوز کئے ہوئے تھی۔ متحدہ روس کے سبھی حصوں سے اس کانگریس کے نام ہزاروں خط آئے، جن میں سلامتی کی دعائیں تھیں، استقبال تھا، مبارکبادیں تھیں اور اخلاقی مشورے تھے۔ خط لکھنے والوں میں،

مزدور تھے، کسان تھے، طالب علم تھے، نوجوان اور دانشور اور سائنسدان، آرٹسٹ تھے اور فن کار تھے۔ ان سبھی لوگوں نے روسی ادب اور اس کے خالقوں کو محبت سے نوازا تھا۔''[۱۲]

اس کانگریس نے ادیبوں کے روح و جسم میں نیا جوش اور نئی توانائی بھر دی جس کا ثمرہ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ملا۔ جب کلچر کے تحفظ کے نام پر شہرۂ آفاق کانفرنس بلائی گئی اور مصنفین کی بین الاقوامی انجمن بنائی گئی۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں فرانس کے شہر پیرس میں کلچر کے تحفظ کے نام پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی گئی۔ یہ کانفرنس گزشتہ سبھی کانفرنسوں اور میلوں سے زیادہ اہم تھی کیوں کہ اس میں پہلی بار ادیبوں سے عملی اور انقلابی ادب تخلیق کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس تاریخی کانفرنس کو بلانے کا سہرا فرانسیسی ادیب ہنری باربس کے سر جاتا ہے۔ جس نے بڑی کوششوں کے بعد اسے عملی جامہ پہنایا۔ اس کے علاوہ کانفرنس کو بلانے والوں میں میکسم گورکی، روماں رولاں، آندرے مارلو، ٹامس مان، آئی۔ ایم۔ فوسٹر اور والڈو فرینک وغیرہ بھی تھے۔ یہ تاریخی جلسہ پیرس کے مشہور ہال 'بال بولیے' میں منعقد کیا گیا۔ جس میں اہل دانش اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں گم کرنے آئے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ کانفرنس میں شامل سبھی ادیب ایک ہی خیال اور ایک ہی مکتب فکر کے رہے ہوں، مگر یہ ضرور تھا کہ سبھی اس بات پر متفق تھے کہ فاشزم اور سرمایہ داروں اور اقتدار پرستوں کے ظلم سے کلچر اور اپنی تہذیب اور انسانیت کو بچانا ہے۔ سبھی ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں سے اپیل کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ اپنا علم، اپنا فن، اپنا آرٹ سب کچھ انسانیت کی خدمت میں لگا دیں۔ ان سے کہا گیا کہ :

''رفیقانِ قلم موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔
ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم، ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کے خلاف دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، جو

روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔''[۵]

اس کانفرنس نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ اس میں پہلی بار مصنفوں اور ادیبوں کی ایک انجمن بنائی گئی جسے International Writers Association کا نام دیا گیا۔ اس سے پہلے ادیبوں کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ پیرس کانفرنس نے کم سے کم اتنا ضرور واضح کر دیا کہ پڑھنے لکھنے والا طبقہ، مظلوموں کے حق میں، انسانیت کے حق میں اور انصاف کے لئے اپنے علم و شعور کا تعاون کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ جو ادیب و شاعر خوشگوار ماحول اور سازگار مواقع پر حسین اور لطیف تخلیقات کرتے ہیں انھیں پریشان کن حالات میں پر جوش اور پر اپیل تصنیفات بھی کرنی چاہئے۔

اس کانفرنس میں مختلف ملکوں (چین، جاپان، ترکی، عرب، امریکہ اور یورپ کے زیادہ تر ممالک) کے عالمی شہرت یافتہ ادیب، دانشور یا نمائندے شریک ہوئے تھے۔ ہندوستان سے ممبئی کی پارسی خاتون مدام صوفیہ تھیں جبکہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند محض تماشائی کی حیثیت سے گئے تھے۔ سبھی اس بات پر متفق تھے کہ تہذیب و تمدن کو فاشزم سے بچانا ہے اور حق گوئی، ہمدردی اور انصاف کے وصف کو پھر سے زندہ کرنا ہے۔ سبھی شرکاء نے کئی دن تک بحث و مباحثہ کیا۔ اس کانفرنس کا دروازہ سب کے لئے کھلا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں عوام نے ٹکٹ خرید کر شرکت کی اور ان میں بڑی تعداد مزدوروں کی تھی۔ پیرس کی اس کانفرنس نے دوسرے ملکوں میں بھی ترقی پسند تحریک کے آغاز کو تقویت دی۔ ہندوستانی انجمن ترقی پسند مصنفین جو کہ پہلے ہی قائم ہو چکی تھی اس نے اپنے کو اس عالمی انجمن International Writers Association سے جوڑ لیا۔

لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین (ہند) کا قیام

۱۹۳۵ء

ہندوستان سے یورپ گئے ہوئے کچھ نوجوان وہاں کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جو دنیاوی حالات تبدیل ہو رہے تھے اور دوسری عالمی جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے ایسے میں پورا یورپ کشمکش اور تذبذب کے درمیان سانس لے رہا تھا۔ اس لئے ان طالب علموں کا وہاں پر ہونے والے حادثات اور سانحات سے روز سابقہ پڑتا تھا۔ جرمنی اور اسپین اور دیگر ممالک سے جلاوطن کئے گئے لوگ نظر آتے جو فاشزم اور اقتدار پرست طاقتوں کے ستائے ہوئے ہوتے تھے۔ حریت پسند اور آزاد خیال لوگ جو کہ اشتراکی نظام سے متاثر ہوتے تھے انھیں طرح طرح سے اذیتیں دی جاتیں۔ یہ مزدور کے لیڈر ہوتے تھے، ادیب ہوتے تھے، مدرس یا معلم ہوتے تھے۔ ان سب کی حالت کو دیکھ کر ذی شعور لوگوں کی طرح یہ طلباء بھی متفکر ہوتے۔ ان کا ذہن ظلم، سرمایہ اور اقتدار کے اس قبیح چہرے سے مغموم تھا۔ ان مشاہدات نے ان کے اندر وہ شعور پیدا کر دیا جس کے ذریعہ ظلم و تشدد اور بربریت کا احتجاج کیا جا سکتا ہے۔ ان طالب علموں میں سجاد

ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا، جیوتی گھوش وغیرہ تھے۔ اس وقت کے حالات کو بیان کرتے ہوئے سجاد ظہیر کہتے ہیں:

''ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے، نکالے ہوئے، مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سے سنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دلعزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ خوف ناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہونے کے بارے میں اخباروں میں چھپتے۔ وہ اندوہناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا (جرمنی) سے پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراونی چھاپ ڈال رہا تھا۔ اور ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کا مقابلہ کر سکتی تھی اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت۔ اس جماعت کی طاقت جو اکٹھا ہو کر کام کرنے سے مسلسل طبقاتی جدوجہد کا تجربہ حاصل کر کے ایک ایسا انقلابی جماعتی شعور پیدا کرتی جا رہی تھی جو اسے سماج کو پیچھے گھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست دینے اور مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کرنے کا بدرجہ اتم اہل بناتی۔''[۲]

اس مضمون میں طالب علموں اور خود اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔"[۲]

اور اس کے بعد تو جوان طلباء ان پیچیدگیوں اور دلسوز مسئلوں کو سمجھنے کے لئے اسے حل کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر سجاد ظہیر کے کمرے پر بیٹھنے لگے۔ وہاں پر ادبی، سیاسی اور سماجی گفتگو کرتے۔ اس حلقہ نے دھیرے دھیرے انجمن کی شکل اختیار کر لی۔ اس انجمن نے تمام بحث و مباحثے کے بعد ایک ایک لفظ کو ایک ایک جملے کو متعدد بار جانچ اور پرکھ کر کے ایک اعلان نامہ (مینی فسٹو) ترتیب دیا جسے ملک راج آنند، جیوتی گھوش اور سجاد ظہیر نے مل کر آخری شکل دیا اور اسے ایک جلسے میں پڑھنے اور نشر کرنے کے لئے کوشاں ہو گئے۔ جون ۱۹۳۵ء میں وہ تاریخی دن بھی آیا جس میں اس انجمن کی باقاعدہ بنیاد پڑی۔ یہ تاریخی جلسہ لندن کے "ڈن مارک اسٹریٹ" پر واقع "نان کنگ" ریستوراں میں ہوا۔ انجمن کے قیام کا اعلان کیا گیا اور اسے "انجمن ہندوستانی ترقی پسند مصنفین" (Indian Prograssive Writers Association) کا نام دیا گیا اور ڈاکٹر ملک راج آنند اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ اس جلسے میں جو مینی فسٹو پڑھا گیا وہ اس طرح تھا:

ترقی پسند ادیبوں کا پہلا اعلان نامہ (مینی فیسٹو)

(لندن میں منظور)

''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کے راستے میں لگانے میں ممد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب، قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے، ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی۔ اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہو گئی ہے۔ جذبات کی نمائش عام ہے، عقل و فکر کو اکثر نظر انداز بلکہ رد کر دیا گیا ہے۔ پچھلے دو

صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخی انحطاطی دور ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے۔ جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کرسکیں۔ ہم ہندستان کی تہذیب کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی اور تنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جس سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے۔ اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب جو کچھ ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے، جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل اور ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کی قوت دیتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یکجہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں :

ا۔ ہندستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمن قائم کرنا۔ ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعاون پیدا کرنا۔ صوبوں

کی مرکزی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

۲۔ ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو جس سے ہم تہذیبی پس ماندگی کو مٹا سکیں اور ہندستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

۴۔ ہندستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

۵۔ فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔

۶۔ ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا، عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لئے امداد چاہتے ہوں۔"

لندن میں منظور اس اعلان نامے پر سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا، جیوتی گھوش، ایس بھٹ اور ایس سنہا نے دستخط کیے تھے۔ اب لندن میں باقاعدہ انجمن نے اپنے جلسے کرنے شروع کر دیے۔ جس میں مضمون اور مقالے پڑھے جاتے اور اس پر بحثیں ہوتیں۔ سجاد ظہیر کا ڈرامہ "بیمار" اور ملک راج آنند کا افسانہ "دی ٹرسٹ" اسی زمانے کی تخلیق ہیں۔ ہندستان کے ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ایک بار اس جلسے میں شرکت کی تھی اور تقریر بھی کی۔ سجاد ظہیر نے اس اعلان نامے کو ہندستان میں اپنے دوستوں کے پاس بھیج دیا کہ وہ سب اسے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو دکھا کر ان سب سے ان کی منشا کا پتہ لگائیں۔ ان کے رویوں کو سمجھیں اور اس بات پر آمادہ کریں کہ لوگ اس تحریک کا حصہ بنیں اور بنائیں۔

ہندستان میں ترقی پسند تحریک کی شروعات

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ پوری دنیا (بشمول ہندستان) کس طرح سماجی، سیاسی و اقتصادی بحران میں مبتلا تھی۔ اس کے اسباب فاشزم، سرمایہ پرستی اور سامراجی نظام تھے۔ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اور انھوں نے یہ حکومت مغل بادشاہوں سے چھینی تھی۔ نیز ہندستان کے چھوٹے چھوٹے رجواڑے اور ریاستیں بھی انھوں نے سلب کر رکھی تھیں۔ اس کی وجہ سے امراء ورؤسا انگریزی حکومت سے متنفر تھے کیوں کہ ان سے اقتدار چھین لی گئی تھی اور ان کی شان گھٹ کر رہ گئی تھی۔ دوسری طرف انگریزوں نے ہندستان میں کھیتی باڑی اور زمین جائداد کے نظام میں بھی تبدیلی کر دی تھی۔ جس سے عوام کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔ پھر انگریزوں کی لالچ، ہندستانی قوم کو اپنی نسل اور قوم سے بدتر سمجھنے کی دھن، ہندستانیوں سے بھید بھاؤ اور لوگوں کا استحصال بھی عروج پر تھا۔ جس سے عوام بھی بری طرح سے پریشان تھی۔ انگریزوں کی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" نے بھی ہندستانی سماج کو متاثر کیا۔ ان ساری باتوں نے ہندستانی قوم کو انگریزوں کا دشمن بنا دیا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر جسے انگریزوں نے اپنی سوجھ بوجھ، ترقی یافتہ جدید اسلحوں اور اپنے

بہترین وسائل سے کچل تو دیا مگر ہندستانیوں کی بہادری اور اپنے خلاف نفرت اور لڑنے مرنے کا جوش دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے۔ لہٰذا اب ہندستانیوں پر مزید ظلم ہونے لگے یا یہ کہیں کہ جانوروں سا سلوک ہونے لگا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تشکیلی عمل کے متعلق جو تاریخی حقائق سامنے آتے ہیں اس اعتبار سے اس کا قیام انگریزوں کی ایک چال تھی جسے اے.او.ہیوم (جو انگریزی حکومت کے ایک بڑے افسر تھے) کی پہل پر کچھ باشعور ہندستانیوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کے ذریعہ ہندستانی باشندوں میں پیدا ہونے والے غم وغصہ، ان کی سازشوں اور حکومت کے خلاف ان کے خیالات کا پتہ چلتا رہے گا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہی کانگریس آگے چل کر انگریزی حکومت کے گلے کا پھانس بن گئی اور اس نے حصول آزادی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کہنے کو تو یہ تقسیم انتظامی امور اور درستگی کے نام پر کی گئی مگر سچائی یہ تھی کہ اس بہانے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اکثریت والے خطوں کو الگ کر کے مذہبی ٹکراؤ اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ ان دو قوموں میں نفاق پیدا کر کے قومیت کے جذبے کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔ خیال رہے کہ صوبۂ بنگال اس وقت پورے ہندستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور صوبہ تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کا دلسوز واقعہ ہوا۔ نہتے شہری پُرامن طریقے سے جلیاں والے باغ میں جلسہ کر رہے تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں حکومت کے خلاف احتجاج درج کرانا چاہتے تھے۔ یہ جلسہ جلوس کی شکل میں بدلتا اس سے پہلے ہی جنرل ڈائر نے ان بے گناہوں اور بے قصوروں پر گولیاں چلوا دیں۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ اس واقعے سے لوگوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف اور نفرت بھر گئی۔ ادیب و شاعر بھی اس نفرت، غلامی، ظلم کے خلاف نظمیں کہنے لگے اور مضامین لکھے جانے لگے۔ رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ حصول آزادی کے لئے ہونے والی جدوجہد کی خبروں کو لوگوں تک پہنچایا

جانے لگا۔ حب الوطنی کے مضامین لکھ کر لوگوں کو غیرت دلایا جانے لگا۔ اور کوشش کی گئی کہ ملک کا ہر باشندہ حصول آزادی کے لئے دامے، درمے اور سخنے تیار ہو جائے۔ غرض کہ اب ہندستان کا بیشتر شہری انگریزی حکومت سے، اس کے رویوں سے، اس کے حکومتی نظام سے برانگیختہ تھا اور کسی بھی قیمت پر آزادی چاہتا تھا، جمہوریت چاہتا تھا اور اپنے ملک کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے جہاں بیشتر ہندستانی انگریزی حکومت سے چھٹکارا چاہتے تھے اور دامے، درمے وسخنے کسی بھی طرح کچھ بھی کرنے کو تیار تھے وہیں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو انگریزوں کی چاپلوسی کرتے تھے، ان کی خوشامد کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل کر مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور عام شہریوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ یہ تھے سرمایہ دار، زمیندار، مہاجن اور ایسے بااقتدار لوگ جنھیں انگریزوں کی قربت اور حمایت حاصل تھی۔ (دراصل یہ حمایت نہیں بلکہ مصلحت ہوتی تھی) ان لوگوں نے سماج کو بری طرح سے جکڑ رکھا تھا۔ کیونکہ ان کا دخل براہ راست ان غریبوں اور مفلسوں کے گھروں، کھیت کھلیانوں تک تھا۔ غرض کہ ان سب حالات نے ہندستانیوں کو اس نکتے پر غور و فکر کرنے کے لئے مجبور کر دیا کہ کیسے اس انگریزی حکومت سے، ملکی سرمایہ داروں اور زمین داروں سے چھٹکارا پایا جائے اور اس کے بعد اخوت، مساوات اور اخلاقیات کے اقدار قائم ہوں۔ مختلف الخیال لوگوں نے مختلف نظریے سے ان مشکلات سے باہر نکلنے کی سوچی۔ اصلاحی، سیاسی اور سماجی پارٹیاں بنا کر یا تحریکیں چلا کر۔ انھیں میں سے ایک تحریک ترقی پسند ادبی تحریک بھی تھی۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین (ہند) کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کے اعلان نامہ کو ہندستانی میں اپنے دوستوں کے پاس ان کی آراء جاننے کے لئے بھیجا تھا۔ ان میں الہ آباد میں انگریزی کے استاد احمد علی تھے، امرتسر میں محمود الظفر اور ان کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بمبئی میں

بھتھی سنگھ تھے، علی گڑھ میں تاریخ کے استاد ڈاکٹر محمد اشرف تھے، کلکتہ میں ہیرن مکرجی تھے اور حیدرآباد (دکن) میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے۔ جب سجاد ظہیر ۱۹۳۵ء میں لندن سے ہندستان آئے تو انھوں نے اپنے اس خیال کی ترویج و اشاعت کے لئے یہاں کے مختلف قد آور اور بزرگ ادیبوں و دانشوروں سے رابطہ قائم کیا۔ چونکہ سجاد ظہیر انجمن کے جنرل سکریٹری تھے نیز کمیونسٹ نظریے کی طرف ان کا جھکاؤ بڑھ چلا تھا اس لئے جیسے ہی وہ ہندستان پہنچے انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ روشنائی میں سجاد ظہیر رقم طراز ہیں:

> "جہاز ڈاک کے کنارے سے آ کر لگ گیا۔ چاروں طرف شور اور ہنگامہ تھا۔ ڈاک کے چبوترے پر مسافروں کے دوست اور رشتہ دار، مرد اور عورتیں ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے اپنے عزیزوں کو پہچان کر دور سے انھیں سلام کر رہے تھے۔.........
> میں اپنا اسباب جمع کر کے تیسرے درجہ سے جہاز کے فرسٹ کلاس کے ہال میں آ گیا۔ جہاں پولیس کا انگریز افسر تمام مسافروں کے پاسپورٹ دیکھتا اور انھیں جہاز سے نیچے اترنے کی اجازت دے رہا تھا۔ اتنے میں میرے دوست بھتھی سنگھ آ گئے۔ ہم گلے ملے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کچھ لوگ ہمارے بہت قریب کھڑے گفتگو سننے کی کوشش کر رہے ہیں میں نے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ان کی شکل سے پہچان گیا کہ یہ حضرات سی. آئی. ڈی. کے ہیں۔ جب میرے پاسپورٹ دکھانے کی باری آئی تو وہ حضرات میرے پیچھے لگے لگے اس میز تک آئے جہاں پاسپورٹ افسر بیٹھا تھا۔ میرے پاسپورٹ کو کافی دیر تک بڑے غور سے دیکھنے کے بعد اور اس کے اندراجات سے بہت سی باتیں نوٹ

کر لینے کے بعد مجھے نیچے جانے کی اجازت تو مل گئی لیکن سی. آئی. ڈی. والے باڈی گارڈ کی طرح میر ساتھ چپکے رہے......کپڑوں وغیرہ کا تو میرے پاس ایک ہی سوٹ کیس تھا لیکن دو بڑے بڑے ٹرنک اور بھی تھے جن میں دو ڈھائی سو کتابیں، میگزینیں، کاپیاں، کاغذات وغیرہ بھرے تھے۔اس "خطرناک مال" کی تلاشی کسٹم والوں کو لینی تھی۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے دیکھا کہ جہاز کے تمام مسافر ایک ایک کر کے کسٹم سے گزر گئے۔ یہاں تک کہ میں اکیلا رہ گیا۔ میری ایک ایک کتاب، ایک ایک کاغذ کو انگریز کسٹم اور پولیس کے افسروں نے باہر نکال کر ڈال دیا۔ اور ان کی جانچ شروع ہوئی۔ اس حرکت پر میرے کسی قدر استعجاب پر پولیس انسپکٹر نے شرمندہ ہو کر مجھ سے معذرت کی اور کہا کہ میں یہ سب کچھ 'اوپر' کے احکام کے مطابق کر رہا ہوں۔ اس نے ازراہ مہربانی میرے لئے کرسی منگائی اور کہا کہ آپ آرام سے بیٹھ جائیں.........وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھتے ہی اپنی آزادی اور ایک انسانی حق پر اس ناشائستہ اور جاہلانہ حملے نے بڑی صفائی سے یہاں کی سماجی اور سیاسی حقیقت کے ایک پہلو کو روشن کر دیا، جس کا علم تو مجھے تھا لیکن ابھی تک اتنا واضح اور ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ بین الاقوامی رجعت پرستی کے جال ملکوں ملکوں میں بچھے ہیں۔ میرے ہندستان آنے کی اطلاع میرے عزیز اور دوستوں سے پہلے ہی سامراج کے شکاری کتوں کو پہنچ گئی تھی۔ اور ان کی نظروں میں میں اسی نگرانی کا سزاوار تھا چونکہ میں انگلستان اور فرانس میں ترقی پسند اور سامراج دشمن حلقوں میں وقتاً

فوقتاً دیکھا جاتا تھا، چونکہ ہندستانی طلبہ کے درمیان بیٹھ کر سامراج دشمنی کا کبھی کبھی اظہار کر دیتا تھا ایسے خیالات اور جذبات کا رکھنا اور اس کا اظہار بھلا کیا اہمیت رکھتا ہے؟ بہت کم۔ اصل چیز تو عمل ہے، تحریک ہے، لوگوں کو متحرک کرنا اور خود متحرک ہونا۔ اس سے ہم ابھی کافی دور تھے لیکن سامراجیوں اور ان کے اہلکاروں کے نزدیک خیال اور تصور اور جذبہ بھی خطرے سے خالی نہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتے ہیں کہ خیال اور جذبہ عمل کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اور ان کا یہ گمان آخر ٹھیک ہی تھا۔'' ۸

یہ سیاست کی وہ نظر تھی جس نے تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی پینی نظر تحریک کے بانی پر مرکوز کر دی تھی۔ بہر حال سجاد ظہیر نے بمبئی میں گجراتی کے مشہور ادیب کنہیا لال منشی اور ان کی بیوی شریمتی لیلاوتی سے ملاقات کی اور ترقی پسند مصنفین کے مجوزہ اعلان نامے پر ان کی رائے جاننی چاہی۔ لیکن سجاد ظہیر کو یہاں خاطر خواہ پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ پھر سجاد ظہیر الہ آباد آ گئے جہاں پر ان کی ملاقات یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد احمد علی اور فراق گورکھپوری سے ہوئی اور پھر سید اعجاز حسین سے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت امرناتھ جھا اور ڈاکٹر تارا چند سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''اب ہم نے تین فوری مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا شروع کیا۔

پہلا الہ آباد میں اردو اور ہندی کے ادیبوں کو ملا کر ترقی پسند مصنفین کا ایک حلقہ قائم کرنا۔

دوسرا ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامہ کے مسودے پر ادیبوں، شاعروں اور تمام دانشوروں کے دستخط کرا کے اسے شائع

کرنا۔

تیسرا ہندستان کے مختلف شہروں میں اپنے ہم خیال ادیبوں سے ربط قائم کرکے انھیں آمادہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔''۹

دسمبر ۱۹۳۵ء میں الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی میں اردو ہندی کے تعلق سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں اردو ہندی کے ممتاز ادیب وشاعر شریک ہو رہے تھے۔ اس کے مہتمم ڈاکٹر تارا چند تھے۔ اس سیمینار میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، مولانا عبدالسلام ندوی، منشی دیا نرائن نگم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، رشید جہاں وغیرہ نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ احمد علی، فراق گورکھپوری، وغیرہ تو یہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ یہ کانفرنس الہ آباد یونیورسٹی کے وجیا نگرم ہال میں ہوئی جہاں سجاد ظہیر نے منشی پریم چند سے ملاقات کی۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی کو انجمن کے اغراض ومقاصد پر غور وفکر کرنے کے لئے اپنے گھر پر بلایا۔ ڈاکٹر رشید جہاں (محمود الظفر کی بیوی) امرتسر سے آئی ہوئی تھیں۔ اور وہ پوری طرح انجمن کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ سجاد ظہیر نے جو اعلان نامہ لندن سے اپنے دوستوں کے پاس بھیجا تھا ان میں محمود الظفر بھی شامل تھے اور وہ اس کے اغراض ومقاصد سے متفق تھے۔ بہر حال مذکورہ تینوں حضرات اور منشی دیا نرائن نگم سجاد ظہیر کے گھر آئے اور مولوی عبدالحق نے مینی فیسٹو پر فوراً دستخط کر دیے، اس کے بعد پریم چند اور جوش ملیح آبادی اور نگم نے دستخط کیے۔ ان معتبر حضرات کی حمایت اور سرپرستی کے بعد سجاد ظہیر رشید جہاں کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گئے تاکہ وہاں پر جا کر وہاں کے ادیبوں وشاعروں سے ان کی رضامندی حاصل کر سکیں۔ سجاد ظہیر رشید جہاں کے گھر پر مقیم ہوئے جہاں ان کی ملاقات مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض سے ہوئی۔ فیض اس وقت محمود الظفر کے کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ابھی تک فیض

رومانوی شاعری میں غرق تھے مگر ترقی پسند رجحان سے انھیں رغبت تھی۔ رشید جہاں کی ایماء پر وہ تحریک سے جڑے اور خوب جڑے۔ محمود الظفر، رشید جہاں، فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر پنجاب کے مقتدر لوگوں سے ملے اور ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد پر بحث کی۔ ان میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، میاں بشیر احمد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فیروز دین منصور، اختر شیرانی وغیرہ کا نام اہم ہے۔ میاں بشیر اردو رسالہ 'ہمایوں' کے مدیر تھے۔ یہاں پر ایک چھوٹی سی نشست بھی ہوئی جس میں ترقی پسندی کو لے کر کچھ سوالات قائم کئے گئے۔ جیسے قدیم کلاسیکی ادب کے تئیں ترقی پسندوں کا رویہ کیا ہوگا؟ عاشقانہ و غنائیہ شاعری کو ترقی پسند کس زمرے میں رکھیں گے؟ غالب یا شیکسپیئر ترقی پسند ہیں یا نہیں؟ کیا ترقی پسند ادیب ہونے کے لئے کمیونسٹ یا سوشلسٹ ہونا ضروری ہے؟ اور مذہب کی طرف ترقی پسندوں کا کیا رویہ ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جوابات سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں نے کچھ حد تک پیش کیے مگر زیادہ تر سوال، سوال کی ہی شکل میں رہ گئے۔ اس کے بعد لاہور میں ایک انجمن تشکیل کی گئی جس کے عارضی جنرل سکریٹری صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بنائے گئے اور یہ امید کی گئی کہ جب انجمن کے باقاعدہ ممبر بن جائیں گے تو عہدیداروں کا انتخاب بھی کر لیا جائے گا۔ آگے چل کر علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور حیدرآباد وغیرہ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمنیں قائم ہوئیں اور ترقی پسند ادب کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھنے لگا۔ اسی ضمن میں یہ بتا دینا بہتر ہوگا کہ جب سجاد ظہیر دوبارہ پنجاب گئے تو وہاں پر ان کی ملاقات ڈاکٹر علامہ اقبال سے ہوئی اور علامہ نے ان کی تحریک کی حمایت میں چند کلمات بھی کہے، جس کا ذکر سجاد ظہیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "پنجاب کے اسی سفر میں مجھے علامہ اقبال سے بھی ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلی بار جب میں لاہور آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ظاہر ہے اقبال سے ملنا اور ترقی

پسند ادب کی تحریک سے متعلق ان سے گفتگو کرنا ہمارے لئے ضروری تھا۔ تاثیر نے ہمیں امرتسر میں بتایا کہ انھوں نے علامہ سے نئی تحریک کے بارے میں گفتگو کی ہے اور انھوں نے اس سے ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ امرتسر سے ڈاکٹر اشرف اور میں لاہور آئے اور میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے۔ میاں صاحب نے علامہ اقبال سے ہمارے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ ہم تیسرے پہر چائے کے بعد ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے اور اقبال اپنی کوٹھی کے باہر ایک کھردری بان کی چارپائی پر نیم دراز اپنے بستر کا تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ وہ اشرف سے اور مجھ سے بڑے تپاک اور شفقت سے ملے۔ .... ہمارے ساتھ علامہ اقبال کے التفات وعنایات کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرأت ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلاف اور شکایتیں تھیں وہ ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ کروں۔ سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہوگئی اور شاید میں نے ان سے کہا ہماری نظر میں قوم کی غلامی، بین الاقوامی جنگ، محنت کشوں کے ظالمانہ استحصال کا علاج موجودہ دور میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے بعض مقامات پر اپنے کلام میں اشتراکی نظریہ پر غلط نکتہ چینی کی ہے۔ خودی آزادی خواہی اور انسان نوازی کی منطق ہمیں سوشلزم کی طرف لے جاتی ہے .... وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لئے میری ہمت افزائی فرمارہے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا

تاثیر نے مجھ سے ترقی پسند تحریک سے متعلق دو ایک بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی ہے۔ ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے مستند کتابیں دیں، انھوں نے وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا۔ میرا نقطۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے......... علامہ اقبال سے ترقی پسند تحریک کے متعلق ہماری بات چیت تشنہ اور نامکمل رہی، اس کا مجھے افسوس ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ علامہ اقبال نے ہماری تحریک کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اگلی بار جب پنجاب آؤں گا تو ان سے پھر مل کر تحریک کے متعلق زیادہ وضاحت سے گفتگو کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دوبارہ لاہور گیا تو وہ طائر قدسی اس جہان سے پرواز کر چکا تھا۔"[10]

حواشی

1۔ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از ڈاکٹر کرن سنگھ چوہان صفحہ ۲
2،3۔ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از ڈاکٹر کرن سنگھ چوہان صفحہ ۴
4۔ روسی رسالہ "لٹریری کرٹک"
5۔ سویرا لاہور بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمن اعظمی صفحہ ۳۶
6،7۔ یادیں از سجاد ظہیر
8۔ روشنائی از سجاد ظہیر صفحہ ۲۸، ۲۹، ۳۰
9۔ روشنائی از سجاد ظہیر صفحہ ۳۳
10۔ روشنائی از سجاد ظہیر صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۹

باب دوم

●

پہلی کل ہند کانفرنس، لکھنؤ

(۹۔۱۰؍اپریل ۱۹۳۶ء)

اس بات پر اختلاف ہوسکتا ہے کہ ترقی پسند ادب کا آغاز کب ہوا مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ پہلی بار منظم ہو کر ترقی پسند فکر کی تحریک 'انجمن ترقی پسند مصنفین' نے ہی چلائی۔ اس تحریک سے پہلے بھی ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے اور اس کے ذریعہ عوام کی تیز ان کے مسائل کی بات ہوتی رہی ہے۔ ان کی مقدار بھلے ہی بہت کم رہی ہو مگر اس کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ مگر جب یہ انجمن قیام میں آئی اور اس کا سرکلر ادیبوں اور شاعروں کے درمیان بھیجا گیا تو لوگ اس سے متفق ہوتے گئے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہونے لگے کیونکہ جس مقصد کے تحت اس انجمن کی بنیاد پڑی وہ کسی کا ذاتی مسئلہ نہ تھا، کسی کا صرف اپنا درد نہ تھا بلکہ پورے عوام کا مسئلہ تھا۔ عوام کی تکلیفیں تھیں جن میں ہم آپ اور دیگر بھی افراد شامل ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۹؍اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں پہلی کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا۔ ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب پورے ملک سے مختلف الہسان اور

مختلف الخیال ادیب وشاعر باہم تبادلۂ خیال کرنے کے لئے ،فکری سطح پر ہم آہنگ ہونے کے لئے ،ظلم کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں آواز بلند کرنے کے لئے صف آرا ہو رہے تھے۔ چونکہ یہ تحریک کی پہلی کانفرنس تھی اس لئے جگہ اور وقت کو لے کر اراکین انجمن تذبذب میں تھے۔ اسی دوران لکھنؤ میں جواہر لال نہرو کے زیر صدارت کانگریس اپنا سالانہ جلسہ کرنے جارہی تھی ،اس خبر نے حسن اتفاق کا کام کیا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں :

"سب کی رائے ہوئی کہ اسی زمانے میں لکھنؤ میں ہماری بھی کانفرنس منعقد کی جائے۔ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے یا محض تماشائی کی حیثیت سے ملک کے ہر حصے کے لوگ جمع ہونے والے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ ہماری کانفرنس میں جو ادیب آئیں گے ان کے لئے کانگریس کا اجلاس ایک مزید کشش کا باعث ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ بائیں بازو کی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ ،سوشلسٹ اور دوسرے ترقی پسند نظریوں کے لوگ وہاں اس موقع پر ہوں گے۔ ان کی موجودگی اور حمایت سے بھی ہمیں فائدہ پہنچ سکتا تھا۔" [1]

ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں ہوئی۔ منشی پریم چند کو اس کانفرنس کا صدر چنا گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بہت مشہور ومقبول تھے بلکہ اس لئے کہ وہ خود ترقی پسند خیالات سے معمور تھے، اپنی تخلیق میں عوامی مسائل کو مرکزیت دیتے تھے اور ادب کو مقصدیت سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ پھر انھوں نے اس تحریک کے اغراض ومقاصد کی مکمل کر تائید کی تھی اور اس کے مینی فیسٹو پر دستخط کرنے کی پہل کی تھی جسے سجاد ظہیر نے الہ آباد میں ان کے سامنے پیش کیا تھا (اس پر مولوی عبدالحق ،جوش ملیح آبادی اور دیا نرائن نگم نے بھی دستخط کئے تھے)۔ بہر حال چودھری محمد علی رودولوی کے استقبالیہ خطبے کے ساتھ اس دو

روزہ کانفرنس کا آغاز ہوا۔ چودھری صاحب لکھنؤ کے امرا میں سے تھے اور قدیم تہذیب کے رسیا تھے مگر انھوں نے حالات کو دیکھتے ہوئے بڑی محبت اور جوش کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ ان کا خطبہ تحریری شکل میں تھا مگر دستیاب نہ ہو سکا (ممکن ہے کہ کہیں ہو)۔ اس استقبالیہ خطبے کے بعد کانفرنس کے صدر منشی پریم چند نے اپنا تاریخی خطبہ ادب کی غرض و غایت کے عنوان سے اردو میں پیش کیا۔ پریم چند ہمارے ملک کے اور ہماری زبان کے مستند ادیب ہیں، انھوں نے اپنے خطبے میں جس طرح کے خیال پیش کیے، جن حالات کی نشاندہی کی اور ادیبوں اور شاعروں سے جو اپیل کی وہ آج بھی قابلِ رشک ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کو سب سے زیادہ تقویت پہنچانے والی دستاویز یہی خطبہ ہے۔ پریم چند نے خطبے میں ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی، یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔'' ۲۳

ادب کی مقصدیت پر زور دیتے ہوئے کہا:

> ''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بیشک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے۔'' ۲۴

حسن کے مسئلے پر انھوں نے کہا:

> ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے

وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف
اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔
انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔'' ؎

انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کے لیے تحصیل علم کی ضرورت بتائی اور کہا کہ صرف حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ پریم چند کا یہ خطبہ نہ صرف علمی اور فکری تھا بلکہ عملی بھی تھا۔ ادب کی جس مقصدیت پر انھوں نے زور دیا ہے وہ اس کانفرنس سے پہلے ان کے دل و دماغ میں موجزن تھا وہ اس کے لئے ادیبوں سے تبادلۂ خیال بھی کر رہے تھے اور یہی وجہ ہے کہ جب سجاد ظہیر نے مینی فیسٹو دکھایا تو انھوں نے فوراً اس پر دستخط کر دیئے تھے۔ صرف یہی نہیں انھوں نے اپنا رسالہ 'ہنس' بھی اس تحریک کی توضیع و ترویج کے لئے وقف کر دیا۔ پریم چند کے خطبے کے بعد سجاد ظہیر نے ابھی تک ہوئی تنظیمی اور تحریکی اقدام پر ایک رپورٹ پیش کی جو انگریزی میں تھی۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ فروری ۱۹۳۶ء میں انجمن کی باقاعدہ بنیاد پڑ جانے کے بعد فوراً ہی لاہور، دہلی، الہ آباد اور علی گڑھ میں اس کی شاخ قائم کر دی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم مانتے ہیں کہ ادب کی تخلیق حکم دے کر نہیں کرائی جا سکتی، مگر حالات کو سمجھ کر اسے تحلیل کر کے ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کو فیض پہنچا سکے۔

اگلے اجلاس میں فراق گورکھپوری، احمد علی اور محمود الظفر نے مقالے پڑھے جب کہ ایک بنگالی ادیب سریندر ناتھ گوسوامی نے بنگالی ادب اور وہاں کی انجمن کی کارکردگی پر ایک رپورٹ پیش کیا۔ اردو کے بزرگ شاعر ساغر نظامی نے وطن کی آزادی سے متعلق کئی نظمیں سنائیں۔ پڑھے گئے مقالے حسب ذیل ہیں :

۱۔	فراق گورکھپوری	ہندستانی نو بیداری نئی منزل کی طرف
۲۔	احمد علی	آرٹ کے متعلق ترقی پسند نظریہ
۳۔	محمود الظفر	دانشور اور ثقافتی رد عمل

دوسرے دن (۱۰ اپریل) حسرت موہانی نے اس تحریک کی پرزور حمایت کرتے ہوئے تقریر کی۔ سجاد ظہیر نے روشنائی میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے کہ مولانا اتنے خوش تھے کہ پہلے دن ہی تقریر کرنا چاہتے تھے، مگر انہیں روکے رکھا گیا صرف اس لئے کہ کانفرنس میں تجسس باقی رہے۔ حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہئے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہئے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنی چاہئے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منظم ہو کر اپنے انقلابی جدو جہد کو کامیاب بنا سکیں۔...... محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی تلقین کرنی چاہئے۔ اسے انقلابی ہونا چاہئے، چونکہ موجودہ زندگی میں اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنی چاہئے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کر رہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی، لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔ آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے خاص طور پر اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد

کی طرفداری اور حمایت کا اعلان کروں، جو آپ نے اپنے اعلان نامے میں لکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا۔'' ۵

حسرت موہانی کی یہ حوصلہ افزا تقریر ترقی پسند تحریک کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ مولانا نے زور دے کر کہا کہ اب ملک میں سنجیدہ ادب کی تخلیق ہونی چاہئے۔ انھوں نے بھروسہ دلایا کہ وہ خود اس کام میں پیش قدمی کریں گے۔

مولانا حسرت موہانی کی تقریر کے بعد ملک بھر سے آئے ڈیلیگیٹوں میں سے گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کے نمائندوں نے زبانی تقریریں کیں۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے لوگوں میں سے سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نرائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے، یوسف مہر علی، اندولال یاجنک اور میاں افتخار الدین وغیرہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کملا دیوی نے تو ایک مختصر تقریر بھی کی۔ سروجنی نائڈو بہ سبب علالت خود تو نہ آسکیں مگر اپنا تحریری پیغام بھیج دیا تھا، جسے پڑھ کر سنایا گیا۔

کانفرنس کے آخر میں تحریک کا اعلان نامہ اور انجمن کا دستور منظور ہوا۔ اس دستور کو سجاد ظہیر، عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ چند اہم تجاویز پیش کی گئیں۔ ان میں سے ایک آزادیٔ خیال کے متعلق تھی، جس میں کہا گیا کہ رسالوں اور اخباروں پر پابندی لگانا ظلم ہے، کیونکہ سبھی لوگوں کو اپنا خیال ظاہر کرنے کا حق ہے۔ ایک تجویز امن کانفرنس کی تائید میں پیش کی گئی جو کہ ستمبر میں روماں رولاں کی صدارت میں جنیوا میں ہونے والی تھی۔ انجمن نے جو اعلان نامہ پیش کیا وہ وہی اعلان نامہ تھا جو لندن میں بنایا گیا تھا بس مہاراشٹر کے نمائندوں کی مانگ پر کچھ ترمیم و تنسیخ کے بعد اسے منظور کر لیا گیا۔

ملک راج آنند کو انجمن کا صدر اور سجاد ظہیر کو جنرل سکریٹری چن کر مرکزی دفتر لہ آباد میں قائم کر دیا گیا۔

انجمن کا دستور، اعلان نامہ، اس میں منظور ہوئی تجاویز اور منشی پریم چند کا مکمل صدارتی خطبہ بالترتیب آگے درج ہے۔

maablib.org

انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور

(پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں ۱۰ر اپریل ۱۹۳۶ء کو منظور ہوا)

۱۔ نام : All India Progressive Writers Association

۲۔ اغراض و مقاصد: انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں بیان، جو ۱۰ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منظور ہوا۔

۳۔ انجمن کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ایک آل انڈیا کمیٹی ہوگی جس میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔

(i) مختلف اللسان علاقوں کے نمائندے۔

(ii) شاخوں کے صدر اور جنرل سکریٹری۔

(iii) آل انڈیا کمیٹی کے منتخب کئے ہوئے اہم ادیب اور انجمن کے حمایتی۔

(iv) انجمن ترقی پسند مصنفین کی کسی بھی شاخ یا آل انڈیا کمیٹی کے ذریعہ شائع ہونے والے رسالوں کے مدیر۔

۴۔ (i) آل انڈیا کمیٹی انجمن کے عمومی کاموں کو انجام دے گی۔ یہ ہندستان کے سبھی حصوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرے گی۔ وہ ہر شاخ سے رابطہ قائم رکھ کر ان کے حرکات و سکنات پر نگاہ رکھے گی اور اسے ایسا کرنے میں جو خرچ آئے گا اسے انجمن کی برانچز برداشت کریں گی۔

(ii) یہ کمیٹی ہر زبان میں انجمن کی طرف سے کتابوں اور رسالوں کو شائع کرنے کے لئے سبھی ہندستانی زبانوں میں تین چار لوگوں کی کمیٹی بنائے گی۔

(iii) حالات بہتر ہونے پر یہ کمیٹی ایک انگریزی رسالہ نکالنے کا کام شروع

کرے گی، جو ایک ادارتی مجلس کی نگرانی میں نکلے گا۔

۵۔ یہ کمیٹی اپنے کام کو پورا کرنے کے لئے ایک جنرل سکریٹری اور تین یا چار دوسرے لوگوں کا انتخاب کریگی۔ یہ ایگزیکیوٹیو کمیٹی کہلائے گی۔

۶۔ یہ کمیٹی اپنے لئے دوسرے ممبروں کو نامزد کرنے کا حق رکھے گی۔

۷۔ یہ کمیٹی سال میں ایک بار اپنی میٹنگ کرے گی۔ [۱]

maablib.org

اعلان نامہ

پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منظور (۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء)

ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نئے نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے ہندستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں۔

ہندستانی ادب کی نمایاں خصوصیات یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی بین اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر اور قوئی مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ ہماری انجمن کا مقصد یہی ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردعمل

کے آثار پائے جائیں گے انہیں افشاں کریں گے۔ ہم انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبات کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے اور یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔

ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں کو اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر و ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے :

۱۔ تمام ہندستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشوراتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲۔ ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمانی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جد و جہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

۳۔ ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

۴۔ آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کرنے کی کوشش کرنا۔

تجاویز

(پہلی کل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں منظور)

۱۔ خیال اور اظہار خیال کی آزادی کے بارے میں:

ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس حکومت کے نافذ کئے ہوئے صحافت ایکٹ، کسٹم ایکٹ، جرم قانون کے اصلاحی ایکٹ وغیرہ جو کہ آزادی خیال ورائے پر پابندی عائد کرتے ہیں کا زبردست احتجاج کرتی ہے۔ جس کے ذریعہ حکومت زبردستی اخباروں اور رسالوں کو بند کروا رہی ہے، ترقی پسند ادب پر پابندی لگا رہی ہے۔ یہ کانفرنس ان پابندیوں کو ملک کی تہذیبی ترقی کے لئے زبردست خطرہ سمجھتی ہے اور ملک کے سبھی ادیبوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ حکومت کی اس پالیسی کے خلاف قومی سطح پر احتجاج کریں اور ان قوانین کو رد کروانے کے لئے جاری سبھی کوششوں کی حمایت کریں۔

۲۔ جنگ کے بارے میں:

ہم ادب کو انسانی سماج کی روایت کا ایک جز تسلیم کرتے ہیں جسے ذات، نسل، قوم اور جغرافیائی سرحدوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ اجتماعی اور انفرادی طور پر ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو مساوات، آزادی اور امن پر مبنی ایک نئے معاشرتی نظام کی تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم فاشزم اور لشکریت کی تہذیب مخالف قوتوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ جنگ محض ایک بربریت ہے اور انسانی کلچر اور اس کی ترقی کے

لئے ایک خطرہ۔ ہم امن پسند بین الاقوامی طاقتوں اور ان کی بہترین قومی جذباتوں کی تائید کرنے کا فیصلہ لیتے ہیں۔

۳۔ طالب علموں کے حقوق کے بارے میں:

یہ کانفرنس ہندستانی یونیورسٹیوں کے افسران سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ہندستانی طالب علموں کی انجمنوں، ان کے اخباروں و رسالوں اور تحریکوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے ان کی مدد کریں۔ کانفرنس کا خیال ہے کہ طالب علموں میں تہذیبی ترقی تبھی ممکن ہے جب انھیں سبھی سیاسی موضوعات پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی آزادی دی جائے۔

۴۔ امن کی عالمی کانفرنس کے بارے میں:

یہ کانفرنس روماں رولاں کی صدارت میں ستمبر میں جنیوا میں ہونے والی امن کی عالمی کانفرنس کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتی ہے۔۵

ادب کی غرض و غایت

(پریم چند کا مکمل صدارتی خطبہ جو پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں پیش کیا گیا)

حضرات! یہ جلسہ ہماری ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشاء خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا، وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کر لے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہمارے زبان کے بانیوں نے ہندستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اور اس پر غور کریں کہ جس منشاء سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پچیسی ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للو لال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور

وہی اب ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے، ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشاء نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حیثیتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانے میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب ان میں ہمارے لئے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے اور اس میں حسن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو۔ پھر آپ اسے جس پس منظر میں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چڑے کی حکایت یا گل و بلبل کی داستان بھی اس کے لئے موزوں ثابت ہو سکتی ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں

اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی، یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے،زندگی زندگی۔ دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔ یاس اور درد کی کیفیتیں، آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھی کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے۔ اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بے شک شعر و ادب کا منشاء ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو، ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جز

ہیاور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اردو شاعری، دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب و شاعری کا جو مذاق تھا اس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان کام نہ تھا۔ تحسین اور قدر دانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے، شعرا کے لئے ان کا کلام ہی ذریعہ معاش تھا۔ اور کلام کی قدر دانی روسا و امرا کے علاوہ کون کر سکتا۔ ہمارے شعرا کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لئے یا تو موقع ہی نہ تھا یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے، جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور بیراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اس قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی۔ اور اس نے درجات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا

اپنے ذمے لی ہے اور اس کا آلہ کار ذوقِ حسن ہے۔ وہ انسان میں ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعہ اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے، غیر مستحسن ہے، انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہئے وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علمبردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت اس کے احساسِ حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے۔ مگر عام وکلاء کی طرح وہ اپنے موکل کی جانب سے جا و بے جا دعویٰ نہیں پیش کرتا۔ مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ اختراع نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس عدالت کی تالیف جبھی ممکن ہے جب آپ حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں۔ ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائے گی اور آپ کے خلاف فیصلہ سنا دے گی۔ وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ، وہ مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح سے کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوتِ اظہار بھی، وہ فطرتِ انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے، وہ نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں

کچھ اور مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے، اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے۔ صرف ان کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات و جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جا کر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھوں میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہی تخفیف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت

اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں کہ جیسے گوشت و پوست کے انسان کرتے ہیں۔ وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے ان نکات پر جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک رو بہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی کیرکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔ کیونکہ تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں ہے۔ ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ تحقیق ہونا چاہیے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر ہے یا وہ خود اپنے کیرکٹروں کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لئے ادب کو بعض نقادوں نے مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے بھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ہر شخص کی ذہنیت اور زاویۂ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اس کا ہم خیال ہو جائے، یہی اس کی کامیابی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم ادیب سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی، اپنی وسعت خیال سے ہمیں بیدار کرے، ہم میں وسعت پیدا کرے۔ اس کی نگاہ اتنی باریک، اتنی گہری اور وسیع ہو کہ ہمیں اس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔

بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ جیسے جسمانی

تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری۔ اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اس طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے اسی طرح ہم بھی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اسی لیے ہم سادھو اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار، ہماری بدمذاقی اور محبت کے جذبے سے محرومی ہے۔ جس میں صحیح ذوق حسن ہے، جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کیسے آسکتی ہیں۔ محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کرتا ہے اور محبت کی گرمی اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ ہمارے اندر ایسے جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے۔ مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبۂ حسن سے سرشار نہ ہو اور اس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیونکر عطا کرسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں۔ خوشنوا چڑیاں دیکھی ہیں۔ نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں

ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے۔ سازوں کی ہم آہنگی ہے۔ نغمگیت دلکشی کا باعث ہے۔ یہاں ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو ونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے۔ جہاں اس کا فقدان ہے وہیں افتراق، خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں، جیسے ہماری غیر فطری زندگی کی۔ جہاں فطرت سے مناسبت اور توازن ہے وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشو ونما پاتی ہے تو خباثت نفس کے جراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے مر جاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر خود کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں بیدار ہوتی ہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خصلتاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ شاید ادیب نہ ہوتا۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بیقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت

اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں میں اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے کہ دنیا جینے اور مرنے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرم رکھتا ہے۔ اس کا حساس دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت اور رسوم کی قید میں پڑ کر اذیت پاتی رہے، کیوں نہ وہ اسباب مہیا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے ثباتی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساس کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے مگر شاید اس تخصیص کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ترقی کا مفہوم ہر مصنف کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے انہیں کو دوسری جماعت عین زوال سمجھتی ہے۔ اس لئے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے طابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات سے فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے۔ ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورت حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں اپنی خستہ حالی کا احساس ہو۔ ہم دیکھیں کہ ہم کن داخلی اور خارجی اسباب کے زیر اثر اس جمود و انحطاط کی حالت کو پہنچ گئے ہیں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل

پر اور زیادہ مسلط ہو جائے۔ وہ حسن و عشق کی داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں ہمارے لئے بے معنی ہیں، اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت نہیں پیدا کرتے۔ اگر ہم نے دونو جوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی مگر اس سے ہمارے ذوق حسن پر کوئی اثر نہیں پڑا اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم ان کی ہجر کی تکلیفوں پر رو دیئے، تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی حرکت پید اہوئی۔ ان باتوں سے ہمیں کسی زمانے میں وجد آیا ہو مگر آج کے لئے وہ بیکار ہیں۔ اس جذباتی آرٹ کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو حضرت اقبالؔ کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں۔

رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی　　　در قلزم آرمیدن ننگ است آب جورا
بہ آشیاں نہ نشینم ز لذت پرواز　　　گہے بشاخ گلم گاہ برلب جویم!

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود، پستی، بہل نگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے اور نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بیشک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے۔ اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے، لیکن اساڑھ میں اگر شفق چھا جائے تو وہ

ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہوتی ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے۔ فطرت کا قانون نمو اور ارتقا سے ہے اور جن جذبات، کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے وہ اسی نمو کے معاون ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لئے سازگار بناتا ہے۔ مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں، اس کی حیثیت بھی اضافی ہے۔ ایک رئیس کے لئے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے لئے رنج کا باعث ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ وشاداب باغیچہ میں بیٹھ کر چڑیاں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس عمارت کے لوازمے کو مکروہ ترین سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغ دار ہو رہی ہے۔ اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت کی ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زریں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد بھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی یہ بنیاد کھڑی کرنی چاہی مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی اور آج اعلیٰ و ادنیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ آزمودہ را آزمودن جہل

است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی ہوگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشان دماغ کی خلاقی سمجھ کر بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی و تکمیل کے لئے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے، جس کے لئے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں دی ہیں، جسکی تکمیل کے لئے مذہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اس آئیڈیل کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ اسے مسلمہ سمجھ کر، ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے۔ جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔ ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے۔

ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تو مضحکہ اڑانے کے لئے۔ اس کی دیہاتی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لئے۔ اس کا "شین" "قاف" درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے،

اس کے بھی دل ہے، اس میں بھی آرزوئیں ہیں، یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ آرٹ نام تھا اور اب بھی ہے محدود صورت پرستی کا۔ الفاظ کی ترکیبوں کا۔ خیالات کی بندشوں کا، اس کے لئے کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں ہے۔ بھگتی اور ویراگ اور تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخیلات ہیں۔ اس کے لئے یہی معراج زندگی ہے، اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کشمکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور عریانی میں حسن کا وجود ہو سکتا ہے، اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین عورت میں ہے، غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہارہی ہے۔ اس نے طے کرلیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابروؤں میں فی الواقعی حسن کا باس ہے۔ الجھے ہوئے بالوں، پپڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کمہلائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گزر کہاں، لیکن یہ اس کی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہوئے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت، خود آرائی اور بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہوئے ہونٹوں اور کمہلائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار، عقیدت اور مشکل پسندی ہے، ہاں اس میں نفاست نہیں، نمو نہیں، لطافت نہیں۔ ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں

نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا،
قربانی کا، اسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا۔

در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے یزداں بہ کمند آور، اے ہمت مردانہ

یا

چو موج سازو جودم زیل بے پرواست گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالم گیر ہو جائے۔ جب ساری خلقت اس کے دائرہ میں آ جائے گی، وہ کسی خاص طبقہ تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لئے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بد مذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحہ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کے منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ہمیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندستان کے ادیبوں کو۔ مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا معزز رکن ہے اور وزراء اور امراء اس

سے ملنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ہندستان تو ابھی تک قرون وسطی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ مگر ادب نے جب امراء کی دریوزہ گری کو ذریعہ حیات بنالیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اس میں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لئے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لئے موزوں طبیعت کے سوا کوئی قید نہیں رہی، اسی طرح جیسے مہاتما پن کے لئے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، ان کی روحانی بلندی ہی کافی ہے۔ تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے، اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ لیکن اگر ہم تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکماء نے بھی ادیبوں کے لئے سخت شرطیں عائد کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی، جذباتی تہذیب و تربیت کے لئے اصول اور طریقے مقرر کر دیئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لئے محض ایک رحجان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس۔ اور کسی قسم کی تیاری اس کے لئے ضروری نہیں وہ سیاست، معاشرت، نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادب کے سامنے آج کل جو آئیڈیل رکھا گیا ہے اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں اور اس کا رحجان داخلیت اور انفرادیت تک محدود نہیں رہا۔ وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا

ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے اسے اپنی غرض کا آلہ بنائے، گویا جماعت میں اور اس میں ازلی دشمنی ہے۔ بلکہ اس کے لئے جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنھیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قوی ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لئے کہ عوام کی محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسہ سے اونچی سے اونچی تعلیم پا کر اسے اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سماج میں ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی پسند نہ کرے گا۔ اس سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ وہ ادب کی کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اسے اس صنف پر خصوصاً اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلہ خیال نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادیب کے لئے کافی ہے۔ ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ سماج میں اسے وہ درجہ ملے جو اس کا حق ہے

تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے اور ہم دوسری زبانوں کے ادیبوں کے دستر خوان کے جھوٹے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ہمارا معیار اونچا رہنا چاہیے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچ سکے تو کمر تک پہنچ ہی جائیں گے جو سطح زمیں پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیش نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں۔ جنھیں دولت اور ثروت پیاری ہے ان کے لئے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو ان اپاسکوں کی ضرورت ہے جنہوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے۔ جن کے دل میں تڑپ اور محبت کا جوش ہو۔ اپنی عزت تو اپنے ہاتھ ہے اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں تو اعزاز و امتیاز و شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں۔ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے۔ ہمیں جماعت پر اپنی حقیقت جتانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو۔ دوسروں سے زیادہ آرام و آسائش سے رہنے کی خواہش ہمیں کیوں ستائے۔ ہم امرا کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں۔ ہم تو جماعت کے علمبردار ہیں اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ جو شخص سچا آرٹسٹ

ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لئے نمائش کی ضرورت نہیں، اس سے تو اسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے۔

مردے آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا — می تواں کشت بہ یک جام زلال دگراں

ہماری انجمن نے کچھ اس طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا ہے۔ وہ ادب کو خمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں۔ آئیڈیل کے وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امرا کا ہے وہ امرا کا طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوب ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں جب ہی وہ فضا تیار ہو گی۔ جبھی ادب کے نشاۃ الثانیہ کا ظہور ہو گا۔ ہم ہر ایک صوبہ میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں تا کہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہو گی کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ ہندستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات نے پہلے سے ہی کر رکھی ہے۔ جابجا اس کے انکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا، اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم

ادیبوں میں قوت عمل کا فقدان ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اس کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ فقدان عمل ہی اس کا جوہر تھا کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسائی پر غرائے، اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہو کر رند ہو۔ رند کے شفاعت کی گنجائش تو ہے پارسا کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک ادیب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے۔ مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"[9]

maablib.org

●

الہ آباد کانفرنس

۱۹۳۷ء

پہلی کل ہند کانفرنس کی کامیابی پر اراکین انجمن کا حوصلہ کافی بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں الہ آباد میں، جو کہ اس وقت انجمن کا مرکزی دفتر بھی تھا، اردو اور ہندی کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ الہ آباد کی 'سودیشی انجمن' کے تعاون سے (جس کی سکریٹری محترمہ شیام کماری نہرو تھیں جنھیں ترقی پسند ادب سے لگاؤ تھا) سودیشی نمائش کے پنڈال میں اس کا اجلاس ہوا۔ کسی جلسے کا ایک صدر بنانے کے بجائے مجلسِ صدارت بنانے کی شروعات اسی کانفرنس سے ہوئی ہے۔ بہر حال اس کانفرنس کی مجلسِ صدارت میں مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی کا نام شامل تھا۔ کانفرنس میں ہندی ادب کے دو مہارتھیوں کا مسندِ صدارت پر ہونا یہ غمازی کرتا ہے کہ ہندی ادب کے شرکا اچھی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں مولوی عبدالحق کے علاوہ دونوں صدور نے ترقی پسند ادب کی حمایت کرتے ہوئے پُر زور تقریری اور تحریک کی اشد ضرورت بتائی۔ مولوی عبدالحق عین موقع پر بیمار پڑ گئے تھے جس کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے مگر انھوں

نے اپنا صدارتی خطبہ لکھ کر بھیج دیا تھا جس کو پڑھ کر سنایا گیا۔ منشی پریم چند اور مولانا حسرت موہانی کے بعد یہ تیسرا موقع تھا جب ہمارے کسی بڑے بزرگ نے وہ بھی جو قدیم ادب سے تعلق رکھتا ہو، دل سے ایسی پُر جوش حمایت کی اور تحریک کا خیر مقدم کیا۔ مولوی عبدالحق اردو ادب کے بہت ہی معتبر اور مستند ادیب ہیں، انھیں بابائے اردو کہا جاتا ہے۔ ایسے میں ان کی باتوں کا، دلیلوں کا انکار بھلا کس سے ممکن ہے۔ نئی طرز فکر کا استقبال کرتے ہوئے انھوں نے تنبیہ بھی کی اور کہا کہ ہم زبان کی شیرینی، اس کی لطافت اور طرز بیان سے کبھی غافل نہ ہوں۔ قدیم ادب کو یکسر نظر انداز کر دینے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کا یہ نظریہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہے۔ قدیم ادب میں سب کچھ برا ہو، ایسا نہیں ہے۔ ہمیں وسیع النظری سے اس کا مطالعہ کرنا ہوگا اور حسب ضرورت اس سے فائدہ بھی اٹھانا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ:

"ادب میں بیشک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔ سوکھی شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑ میں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنت سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

(خطبے سے ماخوذ)

ادب کے بھونڈے پن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہیے کہ

جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔"

(خطبے سے ماخوذ)

مولوی عبدالحق نے جو صدارتی خطبہ بھیجا تھا وہ آگے درج ہے۔ اس کا عنوان انھوں نے 'جدید ادب' رکھا تھا۔

جدید ادب

(الہ آباد کانفرنس ۱۹۳۷ء میں مولوی عبدالحق کا صدارتی خطبہ)

"میرے نوجوانو، رفیقو اور دوستو!

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بوڑھا کہیں جارہا تھا چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے" جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بوڑھا یاد آجاتا ہے۔ ایک دوبار نہیں بارہا میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ پہلے کے نوجوان (یعنی تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی۔ بات یہ ہے کہ انسان طبعاً گزشتہ سے بہت حسن ظن رکھتا ہے۔ اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو تو بھول جاتا ہے اور خوبیاں یاد رہ جاتی ہیں مثلاً یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان میں بچوں کا کوئی اچھا مدرسہ نہیں ہے۔ بچپن میں جو ہمیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی تھیں وہ بڑے ہو کر بھول گئے اور یاد رہا تو یہ کہ مکتب میں خوب پٹتے تھے اور جب ہمیں پڑھانے کا موقع ملا تو ہم نے بھی خوب کان اینٹھے اور قمچیاں لگائیں۔ یہ کچھ انسانی فطرت سی ہوگئی ہے کہ گزشتہ کو سراہتا ہے اور حال کو سراپتا ہے۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے

نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے کے نوجوانوں میں نہیں تھی۔ اس لئے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی تو پھر میں نے گزشتہ کی تلافی نہیں بلکہ کفارے کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہ کر سکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصہ میں بعض جانبازکوہ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو۔ جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اکتا جاتا ہے اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ عیاشی اور طرح طرح کے لغویات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت آثار حیات گھٹنے لگتے ہیں

قویٰ میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں امنگ نہیں رہتی، دل دماغ کو ابھارنے کے لئے طرح طرح کے محرکات استعمال کئے جاتے ہیں لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالم نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہل روما جو کچھ کرنا تھا کر چکے تھے اور ان کے پیش نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا اس لئے وہ لہو لعب اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے، اولوالعزمیاں جاتی رہیں، حوصلے پست ہو گئے، کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیاشی ہے مزہ آنے لگا، انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انھیں لے جا کر دفن کر دیا۔

ہمارے اصول وعقائد اور خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے، یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے، بچہ مر جاتا ہے تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینے سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔ یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم ورواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کی دستبرد سے گل سڑ کر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انھیں

کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص کو تسخیرِ جن کا بڑا شوق تھا اور اس کا عمل حاصل کرنا چاہتا تھا بہت دنوں کے بعد اسے ایک عامل ملا۔ بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دھن میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کر کے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا فرمایئے کیا ارشاد ہے؟ جو حکم ہوگا بجا لاؤں گا۔ عامل صاحب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی دانست میں بڑے بڑے مشکل کام اسے بتائے۔ جن نے جھٹ پٹ کر دیئے اور، اور کام کے لئے حاضر ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اس کے لئے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہیے اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کرتا ہے اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کے لئے جو ہر وقت "ھل من مزید" کی صدا دیتا تھا اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اس جن نے انھیں ستانا شروع کیا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین، انھیں ایک ترکیب بہت خوب سوجھی۔ کہا ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اس پر چڑھو اور اترو اور چڑھو اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر اترتے چڑھتے رہو۔ کچھ دن تو وہ اترتا چڑھتا رہا لیکن کب تک؟ آخر اس قدر عاجز اور تنگ ہوا کہ چیخ اٹھا اور عامل صاحب کی دہائی دینے لگا۔ خدا کے لئے مجھے اس عذاب سے بچا لیجئے۔ آپ جو کہیں گے وہی کروں گا اور کبھی کسی قسم کی شرارت نہ کروں گا۔ عامل صاحب نے حکم دیا کہ اترنا چڑھنا بند کرو جب ہم کسی کام کا حکم دیں تو اسے کرو

ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو۔ بیکار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی مگر معاً املی کے درخت کا خیال آتا تو وہیں دبک کے بیٹھ جاتا اب بیکاری کی وجہ سے جن صاحب کا یہ حال تھا کہ کونے میں بیٹھے اونگھا کرتے اور منھ پر مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔

یہ قصہ جھوٹ سہی لیکن نہایت سبق آموز ہے۔ اول یہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بلا ہے کہ جن جیسی ہستی جس میں توانائی اور مستعدی کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ بھی اس سے عاجز آ جاتی ہے۔ دوسرے بیکاری انسان کے قویٰ کو مضمحل اور بیکار اور شوق اور امنگ کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ توانائی آدمی کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کا اقتضا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ انسان کے تمیز و شعور پر ہے کہ کون سا ایسا کام کرے جو ممد حیات ہو، اگر وہ املی کے پیڑ پر ہی چڑھتا اترتا رہا تو سمجھو کہ کھویا گیا۔

ممد حیات وہ کام ہے کہ جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردا نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممد حیات کاموں میں سے ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ زندگی کو زیادہ پُر لطف اور زیادہ کار آمد بنا سکتے ہیں۔ ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر لگا دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ادب وہی کار آمد ہو سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے اور

جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہو سکتی ہے۔

لیکن ترقی کا راستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر و استقلال اور بہت پتہ مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمین آزادی میں ہی پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق نہیں کہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔

آپ کو اپنے خیالات صرف تعلیم یافتہ طبقے تک محدود نہیں رکھنے چاہئیں بلکہ اس کثیر طبقے تک بھی پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے جو ان سب نعمتوں سے محروم ہے، جو آپ کو حاصل ہیں۔ تعلیم عام نہ ہونے سے اس میں آپ کو بہت دشواری آئے گی پھر بھی ان کا خیال مقدم ہے اس لئے کہ ان کے دلوں میں جو ابھی بہت سے آلائشوں سے پاک ہیں ان خیالات کا جمنا آسان ہے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو کہلاتے تو تعلیم یافتہ ہیں مگر دل زنگ آلود ہیں۔ اس پر آپ کو اپنی کانفرنس میں غور کرنا ہوگا یہ نہایت دشوار کام ہے اور اس کام کو انجام دینے والے بہت مشکل سے ملیں گے۔

زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے اس لئے

گزشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی
اصلاح اور آئندہ کی تیاری میں مدد دے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی کے
بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کارآمد ہو یعنی جب تک
ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے نئی تحریک سرسبز نہیں
ہو سکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پرانا بوسیدہ
مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی۔ یہ تشبیہ ممکن ہے کہ
بعض صورتوں میں درست ہو لیکن ادب کے معاملہ میں یہ کامل طور پر
منطبق نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے تخریب لازم نہیں۔ ادب میں بے
شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور
بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی، سوکھی
شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر
پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑ میں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا
ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں لیکن اگر آپ درخت کو ہی جڑ
سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے
کام اور ان کی محنت سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔
اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا
کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے
والے اپنی اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم و
اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔
مجھے معاف فرمایئے گا، میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند
نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو

دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالا ہیں، میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیوں ایسا ہے یہ ایک عام اور معمولی بات ہے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ہر پرانی چیز بری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانہ میں ہوئے ہیں، اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت یا ترقی ہر زمانہ کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں۔ محض ہم اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گزشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہیں۔ ہم گزشتہ کے وارث ہیں اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر ہے یا کما حقہ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو نہ کوئی اصلاح کرسکتا ہے اور نہ خود فائدہ حاصل کرسکتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اس لئے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گزشتہ تاریخ اور گزشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند

مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے کیوں کہ جو چیز آپ کو ورثا ملی ہے اگر آپ اس کے حسن قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا؟ لیکن "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" ہی کافی نہیں "علم پسر آموز" بھی لازم ہے ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں، آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبہ میں بھی ہم ہاتھ ڈالیں ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آئندہ نسلوں پر کیا ہوگا کیوں کہ آئندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقیح وتنقید اسی اصول پر ہوگی۔

دوسری چیز جو آپ کے قابلِ غور ہے یہ ہے کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں اس پر پوری قدرت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے گزشتہ ادب کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ، اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہماری زبان میں، ہمارے خیالات نہیں سما سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیالات ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو، زبان بھی ورثا ملی ہے اور جب تک ہم اس پر قدرت حاصل نہ کریں گے ہم اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ ہمارا نہیں، اصل نہیں نقل ہے،

شاید مستعار ہے، کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں، اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو یعنی جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہے یا کسی دوسرے کا، لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہئے کہ جس وقت لکھنے بیٹھیں صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح دمکتا ہوا نظر آئے لیکن جب خیال ہی ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کے صرف ونحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہئے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں، لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے جو اس گر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا اس کا بیان اکثر ناقص، خیال ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن، اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں، یہ لازم و ملزوم ہیں، انھیں کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے اس لئے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی ساری کوششیں رائگاں ہو جائیں گی اور ان کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں، پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

ادب و زبان کے علاوہ جو ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لئے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دلعزیزی یا کسی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھئے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔

بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ ہے۔ آپ کے قابل رکن کا یہ کہنا کہ "ہم بعض حضرات کی رجعت پسندی سے ناواقف نہیں مگر ابھی ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ صرف اپنے بل پر کھڑے ہو سکیں۔ تنہا اپنے عقائد کی پاکی یا استقامت سے ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر یہ بڑھ کر سماج کے خیالات اور بنائے عمل نہیں بن سکتے تو اسی طرح بیکار رہیں گے جس طرح کوئی مذہبی عقیدہ۔" سراسر غلط ہی نہیں گمراہ کن ہے اگر آپ رجعت پسندی کے سہارے ترقی کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شروع ہی میں سیدھے راستے سے بھٹک جائیں گے اور کبھی منزل مقصود تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ حیرت ہے کہ آپ رجعت اور ترقی کو ایک ساتھ کیسے نبھا سکتے ہیں۔ شاید تیل اور پانی کا ایک جا ہونا ممکن ہے لیکن رجعت اور ترقی کا ایک جا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ یہ کھلی مداہنت اور ریاکاری ہوگی اور یہ ایک چیز آپ کی ترقی پسندی کو بے وقعت کر دے گی اگر آپ کو

"اپنے عقائد کی پاکی اور استقامت" پر اطمینان نہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس خیال کو ترک کر دیں، رجعت پسندی کے بل کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ نہ کھڑے ہوں:

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

سعدی اس خیال میں آپ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ وہ تو ہمسایہ کی امداد سے بھی بہشت میں جانا پسند نہیں کرتا اور آپ رجعت پسندوں کی مدد سے جنت ترقی میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ خیالات نہایت پستی اور کم ہمتی کے ہیں۔ آپ کو کوئی ضرورت تعداد بڑھانے اور شاخیں پھیلانے کی نہیں اگر آپ کے ساتھ بارہ بلکہ بارہ بھی نہیں تین چار بھی ثابت قدم اور راسخ العقیدہ شخص ہیں تو ہندوستان بھر میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک ایک آدمی نے دنیا کو ہلا دیا ہے اور آپ اتنی تعداد میں ہو کر بھی رجعت پسندوں کی آڑ لیتے پھرتے ہیں۔

آپ کا کام اس وقت وہی ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں انسائکلو پیڈسٹ (Encycloppaedist) نے فرانس میں کیا تھا۔ انھوں نے رجعت پسندوں کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، قید میں رہے، جلاوطن کیے گئے، کتاب چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ آخری پروفوں میں تحریفیں کی گئیں اور اصل مسودے جلا دیے گئے۔ یہ سب سہا مگر اپنے عزم سے نہ پھرے۔ اس کتاب میں صرف معلومات ہی نہیں فراہم کی گئی تھیں بلکہ انسان کی روشن خیالی،

خیالات کی انقلاب انگیزی اور توہمات وتعصبات کی بیخ کنی کا سامان بھی جمع کیا گیا تھا۔ اس کے مولفین کی غایت نظریات نہیں تھی بلکہ عمل تھا، ادبی شان دکھانی مقصود نہ تھی بلکہ ان کا منشا زندگی کی تعمیر تھی۔ یہ لوگ سچے مجاہد تھے باوجود مسخ ہونے کے اس کتاب کا اثر صرف فرانس تک ہی نہیں رہا بلکہ دور دور تک پہنچا۔ انیسویں صدی میں جو عقلیت کی ہوا ہندوستان میں چلی تھی اس کا اگر آپ سراغ لگائیں گے تو اس کا سلسلہ بھی ان ہی چند پاک نفوس تک پہنچے گا۔ اس کتاب کو اب کوئی نہیں پڑھتا اور بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جنہیں اس کی کبھی زیارت نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کا اثر اور فیض اب تک جاری ہے۔ یہ صرف چند نفوس تھے۔ مگر دھن کے پکے اور عقیدے کے سچے تھے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے، ان کے کاموں کو دیکھئے اور ان کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کیجئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔ ☆

الہ آباد کانفرنس

مارچ ۱۹۳۸ء

انجمن ترقی پسند مصنفین نے الہ آباد کی پہلی کامیاب کانفرنس کرنے کے بعد مارچ ۱۹۳۸ء میں اردو ہندی ادیبوں کی ہی ایک اور کانفرنس کی۔ اس بار کوشش کی گئی تھی کہ یو. پی. کے باہر سے بھی معقول تعداد میں ادیب شرکت کریں۔ ان کی یہ کوشش رنگ لائی اور بہار، پنجاب، گجرات اور لاہور سے ادیب و شاعر اس کانفرنس میں شریک ہونے آئے۔ یہ کانفرنس اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اس میں ایک تحریری پیغام بھیجا اور ترقی پسند تحریک کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے مسائل کو آرٹ کے ذریعہ حل کریں۔ ان میں سماجی اور سیاسی شعور پیدا کر کے انقلاب کی راہ ہموار کریں۔

مذکورہ کانفرنس بھی ۱۹۳۷ء کی ہی طرح 'سودیشی نمائش' کے پنڈال میں منعقد کی گئی اس کے خاص مہتمم پنڈت بشمبر ناتھ پانڈے تھے جو اس وقت انجمن کی الہ آباد شاخ

کے جنرل سکریٹری تھے۔ چونکہ الہ آباد انجمن کا مرکزی دفتر بھی تھا اس لئے سجاد ظہیر تو موجود ہی تھے ان کے علاوہ لاہور سے فیض احمد فیض، لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری جوش ملیح آبادی، آنند نارائن ملا، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری اور علی گڈھ سے شاہد لطیف اور اشرف علی، بنارس سے امرت رائے، سریندر بالو پوری، گجرات سے کاکا کالیلکر اور مقامی لوگوں میں اعجاز حسین، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین اور وقار عظیم وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مختلف موضوعات پر ادبی مقالے پڑھے گئے اور ریزولیشن پاس کیے گئے۔ کاکا کالیلکر اور نہرو نے تقریریں کیں۔ ہندی کے بزرگ شاعر میتھلی شرن گپت نے اپنی کویتا سنائی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے رسم الخط کو بنیاد بنا کر ایک مقالہ پڑھا جس میں رومن کو رسم الخط بنانے کی تائید کی گئی تھی۔ اس مسئلہ پر کانفرنس میں زوردار بحث ہوئی۔ سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ہے کہ ایک گفتگو کے دوران کاکا کالیلکر نے غصہ میں کہا تھا کہ اگر رومن رسم الخط کی حمایت ہوئی تو میں تحریک کے خلاف پرچار کروں گا۔

کانفرنس کی مجلس صدارت میں جوش ملیح آبادی، پنڈت آنند نارائن ملا اور سمترا نندن پنت شامل تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے جو پیغام بھیجا وہ ادیب کے فرائض کے عنوان سے درج ذیل ہے۔

madlib.org

ادیب کے فرائض

(رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام جو کہ ۱۹۳۸ء کی الہ آباد کانفرنس میں پڑھا گیا)

تخلیق ادب میں تنہائی جتنی مفید ہے اتنی ہی مضر بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تنہائی میں ادیب اپنے نفس سے ہم گوش ہوتا ہے، مطالعے اور مشاہدے کا اصل رمز وہاں ملتا ہے اور دھیان بٹانے کے لئے کسی قسم کا شور و شغب وہاں نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لئے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتا دینے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدم ہو جائیں۔ انسان کی روح کو صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہو جائیں گے تو رہنمایان خلق کو مستقبل کی اصل راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا صور کیا ہے اور زمانہ کس نغمہ کو سننے کے لئے بے چین ہے۔ اس وقت انھیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا، ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انھیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک

سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں مَیں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔

آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے۔ بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو نا امید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لئے تیار ہو تو تمھیں پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یاد رکھو کہ تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی کو اتارو۔ کلی کی طرح سخت

دُھند سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو، پھر یہ دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔"[11]

رابندر ناتھ ٹیگور کا تحریک کی حمایت میں یہ پیغام ترقی پسند مصنفین کے لئے کسی انعام سے کم نہیں تھا۔ یہ انجمن کے لئے بڑی خوشی کی بات تھی کیونکہ ٹیگور ہندوستان کے نہ صرف عظیم شاعر تھے بلکہ عظیم انسان بھی تصور کئے جاتے تھے۔ بنگال میں ان کے علم و فضل کا سکہ چلتا تھا اور انھیں ۱۹۱۳ء میں ادب کا نوبل انعام بھی مل چکا تھا۔ ان کی حیثیت ایک مستند ادیب کی تھی۔ ترقی پسند تحریک جس مقصد کے تحت آگے بڑھی تھی اسے اس وقت ٹیگور کے خیال سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

اس کانفرنس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی ایک تقریر کی ان کی یہ تقریر ادبی نقطۂ نظر سے بہت اہم نہ سہی مگر تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہے اس لئے کہ تحریک کو سیاسی رہنماؤں کی بھی حمایت حاصل ہونے لگی۔ ان کی یہ تقریر ترقی پسند مصنفین کے عنوان سے گفتگو ترقی پسند ادب نمبر میں شائع ہوئی۔

maablib.org

ترقی پسند مصنفین

جواہر لال نہرو کی تقریر (۱۹۳۸ء کی الہ آباد کانفرنس میں)

علم و ادب پر رائے دینے کا مجھے حق تو نہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مجھ سے بھی کم حق رکھنے والے لوگ رائے دے رہے ہیں تو مجھے بھی جرأت ہوتی ہے کچھ کہنے کی۔ مجھے دو تین کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے لیکن میرے پاس ان کاموں کے لئے اب وقت نہیں ہے۔ میری طاقت زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوتی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کے لئے لکھتا ہے؟ اور کیوں لکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہر شخص دے سکتا ہے اور دیئے گئے ہیں۔ ان کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ زندہ کیوں ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی کا؟ زندگی کا مقصد ایک ہے اور دوسری باتیں اس کی جزو ہیں یا زندگی کے ہر بات کے خانے الگ الگ ہیں؟ لوگ وکیل ہوتے ہیں، ڈاکٹر ہوتے ہیں، پروفیسر ہوتے ہیں۔ یہ سب الگ الگ ہیں یا کہ زندگی کی تصویر ایک مکمل تصویر ہے اور یہ سب اس کے حصہ ہیں؟ اگر یہ سب تصویر کے جزو ہیں تو پھر ان کو زندگی کی تصویر میں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو زندگی کی تصویر سے الگ ہو کر ڈھونڈنا چاہیں گے تو ہم بھٹکتے رہیں گے اور کوئی سیدھا راستہ نہ مل سکے گا۔

تم کیوں لکھتے ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزی کمانے کو۔ یہ جواب صحیح ہے اور بہت سے لوگ یہی کہیں گے لیکن یہ جواب کوئی بنیادی جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ جواب یوں دیں گے کہ ہم صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر اسی لئے لکھتے ہیں۔ یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ہم لکھتے ہیں تا کہ لوگوں کی طبیعت بہلائیں۔ طبیعت بہلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ جو مصیبت میں پھنسا ہو اور کچھ دیر کے لئے اس کو بھلاوے میں ڈال دیں۔ اس کے دل سے دکھ، درد کچھ دیر کے لئے نکال لیں۔ جب پڑھنے والا ایسے ادیب کی چیز کو پڑھتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور کچھ دیر کے لئے اپنی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے۔ گویا ایسے ادب کا دوسرا نام بھلاوا ہے۔ جب ہم موجودہ پریشانیوں سے بہت گھبرا جاتے ہیں تو سنیما دیکھنے جاتے ہیں جہاں کچھ دیر کے لئے دنیا کو بھول جاتے ہیں اور ہمارا تھکا ماندہ دماغ بہل جاتا ہے۔ ایسا ادب ہوتا ہے لیکن یہ کچھ بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ معقول آدمی کا کام ہے کہ ذرا زیادہ دور تک دیکھے ایسا ادب بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے سنیما میں ہم تماشا دیکھتے ہیں اس وقت بہت پسند کرتے ہیں اگر کوئی اس وقت کہانی پوچھے تو بتا بھی دیں گے لیکن دس روز کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح جب تک لکھنے والے کے لئے کوئی بڑی بات، کوئی نئی بات نہ ہو، پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر نہیں کر سکتی۔ دنیا میں بہت سے لکھنے والے گزرے ہیں لیکن ان کی وہی کتابیں باقی رہیں جن میں کوئی بڑا

مسئلہ تھا، جس میں دنیا کے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب میں پھر اسی سوال کو دہراؤں گا کہ آپ کے سامنے دنیا کی تصویر کیا ہے؟ اگر وہ ایک مکمل تصویر ہے تو وہ کیسی ہے؟ آپ کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ یہ تصویر اگر صاف ہے اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں اور پڑھنے والے کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں تو ان کی لکھی ہوئی چیز زیادہ اچھی ہوگی۔ انسان کا دماغ موجودہ دنیا سے نکل کر پرواز کرتا ہے اس کے عجیب و غریب خیالات، اس کی عجیب عجیب خواہشیں، اس کو ایک دوسری دنیا میں لے جاتی ہیں جو آج کل کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے اور جہاں وہ تمام مسئلے حل ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں نظر آتے ہیں۔ انسان کا تخیل عجیب چیز ہے وہ اس دماغی دنیا کو رنگ دے کر ایک مکمل تصویر بنا دیتا ہے اور آدمی بے چین ہو جاتا ہے کہ وہاں پہنچ جائے۔

انسان میں سوچنے کی قابلیت تو زیادہ ہے لیکن کرنے کی کم اس لئے بہت سے لکھنے والے دماغی دنیا کو پسند کرتے ہیں، اسی میں بھولے رہتے ہیں لیکن ان کو نہ وہاں پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہ وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی دماغی دنیا ایک خانے میں رہتی ہے اور واقعی دنیا دوسرے خانے میں۔

زیادہ ہمت ور لکھنے والے ان دونوں دنیاؤں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دنیا وہ نہیں ہے جو

ان کے دماغ میں ہے یعنی وہ نہیں کرسکتے جوان کے دماغ میں ہے تو ان کے دل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے؟ اگر پہنچ سکتے ہیں تو اس کا کیا راستہ ہے؟

یہ سوال پہلے کے لکھنے والوں کے ذہن میں بھی اٹھا لیکن ان کو دماغی دنیا تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس وقت انھوں نے اپنی کتابوں کو خیالی دنیا "یوٹوپیا" (Utopia) بنایا یعنی اگر کرنے کی طاقت ہوتی تو ہم ایسا ایسا کرتے، ایسی ایسی دنیا بساتے۔ ان دنیاؤں کو بسانے کے لئے کبھی الٰہ دین کا چراغ نکالا اور کبھی اڑن کھٹولا تیار کیا۔ یہ لوگ مجبوراً اصلی دنیا سے الگ تھلگ رہے اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے رہے۔

لیکن اب دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس دماغی دنیا تک پہنچنے کی صورتیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً پہلے کے لکھنے والوں کو نظر آتا تھا کہ غریبی اور امیری کی تفریق ہمیشہ رہنے والی ہے کیونکہ دنیا میں اتنی دولت ہی نہیں تھی جو اس تفریق کو دور کرنے کی کوشش کرنے تک ذہن پہنچتا۔ لیکن اب سائنس، صنعت و حرفت اور اسباب نقل و حرکت نے اتنی ترقی کر لی ہے یہ مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں اور ایسی دنیا بنا سکتے ہیں جہاں ہر انسان کو ترقی کے یکساں موقعے میسر ہوں۔ جب ایسی کوشش ہو سکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے، کیوں ایسی صورتیں نہ نکالیں جو دماغی دنیا کو موجودہ دنیا کے قریب لے آئیں، اب ہم ان دونوں دنیاؤں کے بیچ میں پل بنا سکتے ہیں۔

ہم اس اچھی دنیا تک کیوں نہیں پہنچتے۔ وہاں تک پہنچنے

میں زیادہ تر لوگوں کا فائدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے وہاں تک نہیں جا سکتے اور زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو وہاں جانا نہیں چاہتے کیوں کہ ابھی انھوں نے اس دنیا کو محسوس نہیں کیا ہے۔

ان دماغی باتوں کو ہم اکیلے پورا کر سکتے ہیں جب وہ انفرادی ہوں لیکن سماجی باتوں کو اسی وقت پورا کر سکتے ہیں جب سارا سماج اسی طرف جانا چاہے۔ کیونکہ چند خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر انسان ساتھ رہتے ہیں۔ انسان، حیوان متمدن ہے اس صورت میں اگر کوئی اکیلا جانا چاہے گا تو دوسرے اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں گے۔

ہم دماغی دنیا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ دنیا کا نہیں۔ مجموعی طاقت ہمارے پاس ہے کہ ہم وہاں پہنچ سکیں۔ سماج کے ہاتھ اتنے پھیل سکتے ہیں کہ وہ دنیا ہمارے قبضہ میں آجائے لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند مصنف وہ ہے جو اس ہونے والی، اس نوزائیدہ دنیا تک پہنچ گیا ہے اب اس دنیا کو واقعی دنیا بنانا چاہتا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ وہاں کھینچ لے جائے۔

موجودہ دنیا کو اس خیالی دنیا تک لے جانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سیاسی حضرات ہیں ان کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن سیاسی حضرات اور قسم کے کوشش کرنے والے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ دے نہیں سکتے۔ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا

ہے اس کی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے اسی لئے وہ بڑی بڑی باتوں کو روزمرہ کی چھوٹی باتوں کے چنگل سے الگ کر کے سماج کو دکھا سکتا ہے۔

مثلاً آج کل ایک سوال اردو ہندی کا۔ یہ جھگڑا ایسا ہے جس نے ملک کی نگاہوں کو پھنسا لیا ہے۔ لوگ بڑی باتوں کو بھول کر اس میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اگر اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو نئے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات اتنے برانگیختہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس پر صفائی سے غور نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی اس کو حل کرنا چاہتا ہے تو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی چال بازی ہے۔

ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پل بناتا ہے۔ جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب لوگ دماغی طور پر وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں ہے تو میں اس کو آرٹسٹ نہیں کہہ سکتا لیکن اگر اس کی انفرادیت ایسی ہے کہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ہلاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے۔ اس کی اکیلی طاقت سماج کو آگے نہیں پہنچا سکتی لیکن اگر اس کے برخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا

نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں قوم کی طاقت آ جاتی ہے اور وہ دنیا کو ہلا دیتی ہے۔ گزشتہ دور میں جتنے بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہوئے شیکسپئر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے دور کے سماج کے نمائندے تھے۔

انفرادیت کے معنی میں ایک الجھن ہے۔ ہم سوشلزم اور کمیونزم کی طرف جا رہے ہیں یہ بالکل سماجی چیزیں ہیں جو ایسا نظر آتا ہے کہ انفرادیت کو فنا کرتی ہے، اس لئے کمیونزم کے دور میں آرٹ کے مٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس دور میں زندگی کا معیار ضرور اونچا ہو جائے گا لیکن یہ معیار ایسی بلندی ہوگی جس کے اوپر تخیل کا کوئی پہاڑ نہ ہوگا۔ ایک پلیٹو سا ہوگا۔ آگے نگاہوں کی دوڑ بند ہو جائے گی۔ انفرادیت کو کمیونزم دبا ضرور دیتی ہے میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن انفرادیت کو فنا نہیں کرتی۔ اس دور میں دب کر انفرادیت کی صورت کیا نکلے گی یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ آج خیالات اور عمل کی آزادی ہے جو شخص جو چاہے کر سکتا ہے اناطول فرانس نے کہا ہے کہ "ہمارا قانون آزاد ہے۔ اگر غریب روٹی چرائے تو اس کو بھی وہی سزا ملے گی جو لکھ پتی کو، اگر وہ روٹی چرائے۔" لیکن واقعہ یہ ہے کہ لکھ پتی کو روٹی چرانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی اس لئے اگر قانون کا ہتھیار چلے گا تو صرف غریب پر۔ ہم کو ترقی کرنے کی بالکل آزادی نہیں۔ جب تک آدمی کو ضروریات کی طرف سے اطمینان نہ ہو، پڑھائی لکھائی نہ ہو، اس وقت تک وہ کیسے ان لوگوں کا مقابلہ کر سکتا ہے جن کو یہ نعمتیں میسر ہیں۔ شہروں میں اور خاص کر

دیہاتوں میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر مواقع میسر ہوں تو ان کی انفرادیت ملک کے کام آئے۔

آج کل دنیا میں انفرادیت دبائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں انفرادیت ترقی نہیں پا سکتی کیونکہ ہر ایک کو ترقی کرنے کے مواقع نہیں میسر آتے۔ جب کھانا، پینا، رہنا سہنا نہیں، تعلیم نہیں، سوچنے کے لئے وقت نہیں تو انفرادیت کیسے ترقی پائے گی۔

اگر انفرادیت ترقی پا سکتی ہے تو صرف سوشلزمی سماج میں، پچھلی دنیا میں، پھر بھی ان لوگوں کو جو موقع حاصل تھا، جو روپیہ پیسہ رکھتے تھے اور اختیارات رکھتے تھے۔ لیکن اب زمانہ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانے میں خیالات کی ترقی کا اور انفرادیت کی ترقی کا موقع ہے یا یہ کہنا کہ سوشلزم آکر انفرادیت کو فنا کر دیگا غلط ہے وہ دور ایسا نہیں ہوگا کہ سب ایک سے ہو جائیں بلکہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے اس لئے کہ اس کے دماغ میں ایک خیالی دنیا ہوتی ہے۔ جیسے وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا تک پہنچ ہو سکتی ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ دنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پل باندھا جائے۔ زمانہ کے شاہکار اسی طرح کے پل ہوتے ہیں۔ پہلے تو پڑھنے والے حسرت سے خیالی دنیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر ادھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے

وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے، خاص خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات، اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔

ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اور انھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں حالانکہ ان کاموں کو ناپا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہیں۔ انقلاب فرانس میں والٹیر کے ایسے ادیبوں کا بڑا دخل ہے اس کا اثر انقلاب کے بعد سو برس تک باقی رہا۔

آنے والے انقلاب کے لئے ملک کو تیار کرنا، اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلہ کو حل کیجئے ان کو راستہ بتایئے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جانا چاہئے، نہ کہ منطق کے ذریعہ۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانا چاہئے۔ آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے وہ آدمی کو پکڑ لیتا ہے پھر منطق اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے۔ مثلاً بنگال میں ٹیگور نے، لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں۔ اسی لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ [12]

دوسری کل ہند کانفرنس، کلکتہ

(۲۴، ۲۵؍ دسمبر ۱۹۳۸ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی دوسری کل ہند کانفرنس دسمبر ۱۹۳۸ء کی ۲۴ ویں اور ۲۵ ویں تاریخ کو کلکتہ میں منعقد کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ اس کے لئے بخوشی راضی ہو گئے، مگر ضعیفی اور علالت کی وجہ سے آخر وقت میں جلسہ گاہ تک نہ آ سکے اور اپنا تحریری خطبہ بھیج دیا جسے کانفرنس میں پڑھا گیا۔ اس لئے ان کی غیر موجودگی میں مجلس صدارت کا انتخاب کیا گیا جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند، سدھیندر ناتھ دت، بدھ دیو بوس، پنڈت سدرشن اور شیلجا نند مکھر جی شامل تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر نریش چندر سین گپت تھے۔ اس کانفرنس میں بنگالی ادب کے دوسرے کئی مشہور ادیب بھی موجود تھے، جن میں مشہور ناول نگار پر ماتنا چودھری، مانک بنرجی اور تارا شنکر بنرجی وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ بنگال کے اردو ادب وصحافت کے ستون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی موجود تھے۔ کرشن چندر پنجاب کی انجمن کے سکریٹری تھے اور وہ اپنے صوبے کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یہیں پر ان کی ملاقات پہلی بار سجاد ظہیر سے ہوئی۔ اردو

کے دیگر ادیبوں اور شاعروں کی لکھنؤ سے کافی تعداد موجود تھی، جن میں ڈاکٹر عبدالعلیم، اسرارالحق مجاز، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر (کانفرنس سے ٹھیک دو ہفتہ پہلے ۱۰ اردسمبر کو سجاد ظہیر اور رضیہ کی شادی ہوئی تھی) احمد علی اور سردار جعفری وغیرہ تھے۔ حیدرآباد سے سبط حسن کانفرنس میں شرکت کے لئے چلے تھے مگر پہنچ نہ سکے اور لکھنؤ میں ہی ٹھہر گئے۔

اس کانفرنس میں ہندی ادب کی نمائندگی کرنے والے بہت کم لوگ تھے اور جو تھے بھی وہ بہار اور بنگال سے تعلق رکھتے تھے۔ بلراج ساہنی جو کہ ان دنوں شانتی نکیتن میں ہندی ادب کے لکچرار تھے اپنی بیوی دمینتی کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ آسام، اڑیسہ، آندھرا پردیس، تملناڈو، گجرات اور مہاراشٹر کے بھی ادیب و نمائندے موجود تھے۔

کلکتہ کانفرنس کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے دستور میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں جو کہ پہلی کانفرنس کے بعد کے تجربوں اور مشاہدوں کے تناظر میں ضروری تھا۔ انجمن کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی بھی چنی گئی اور سجاد ظہیر کی جگہ ڈاکٹر عبدالعلیم کو جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ انجمن نے ایک انگریزی رسالہ نیو انڈین لٹریچر شائع کرنے کا اعلان کیا جس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ملک راج آنند، عبدالعلیم اور احمد علی شامل کیے گئے۔ اب انجمن کا مرکزی دفتر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔

چونکہ یہ کانفرنس پہلی کل ہند کانفرنس سے تقریباً پونے تین سال بعد ہورہی تھی اس لئے اس میں کافی پختگی نظر آئی۔ شعور میں بھی، پیشکش میں بھی اور انتظام میں بھی (آشتوش میموریل ہال میں ہونے والی اس کانفرنس میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ تقریباً ایک ہزار آدمی موجود تھے)۔ پہلی کل ہند کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ایک بہتر بنیاد پڑ جائے اور موثر تحریک آغاز پائے۔ اس کانفرنس میں تحریک کی ضرورت پر باتیں ہوئی تھیں، اس کا استقبال کیا گیا تھا اور بزرگوں نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہی تقاضائے وقت تھا۔ اس وقت بزرگوں نے جو دعائیں دیں، حمایت اور سرپرستی کی وہ اب تین سال میں قدرے کارآمد ثابت ہوچکی تھیں۔ تحریک بالغ ہوچکی تھی، اس لئے کانفرنس باقاعدہ اور باضابطہ تکمیل کو پہنچی۔ مختلف صوبوں

کے نمائندوں نے رپورٹیں پیش کیں۔ مقالے پڑھے گئے، تجاویز منظور کی گئی اور بحثیں ہوئیں۔ اس کانفرنس میں چار تجویزیں پاس ہوئیں۔ پہلی میں کہا گیا کہ تہذیب وتمدن سے محبت کرنے والے لوگ اپنی تخلیق سے، اپنے اخلاق سے اور دوسرے وسائل سے ہندستانی عوام کی مدد کریں اور انھیں سامراجیوں کی غلامی سے بچائیں۔ تحریک آزادی میں مدد کریں۔ دوسری تجویز میں کہا گیا کہ ہندستانی ترقی پسند مصنفین ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرتے ہوئے امن، آزادی اور مساوات کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ تیسری تجویز میں اظہار خیال پر لگی پابندی کو ہٹانے کی بات کہی گئی۔ اور چوتھی میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کی بات کی گئی اور کہا گیا کہ ملک کے سبھی پرائمری اسکولوں میں ہندستانی کو لازمی نصاب میں شامل کیا جائے۔

اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	اردو کی جدید انقلابی شاعری	سجاد ظہیر
۲۔	ہندستان کی سمسیا	عبدالعلیم
۳۔	دیہاتی شاعر اور ہندستانی انقلاب	احمد علی
۴۔	مارکسزم اور ادب	نریندر ناتھ
۵۔	جدید بنگالی ادب	بدھ دیو بسو
۶۔	تہذیبی بحران	ہیرن مکھرجی
۷۔	زوال پذیروں کی حمایت میں	سمر سین

ان سبھی مقالوں پر کھل کر بحثیں ہوئیں اور تبادلۂ خیال بھی۔ بحثوں میں جس طرح سے لوگوں نے حصہ لیا اس سے اندازہ ہوا کہ ترقی پسند نظریہ لوگوں کے دلوں میں کس قدر گھر کر چکا ہے۔ خاص کر تب جب انگریز حکومت کے ساتھ ساتھ کچھ اپنے بھی مخالف تھے۔

اعلان نامہ

دوسری کل ہند کانفرنس، کلکتہ میں منظور (۲۴۔۲۵ دسمبر ۱۹۳۸ء)

"اس وقت ہندستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب یک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور ادب شدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست

طبقوں کے چنگل سے نجات دلاتا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڈھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو ہندستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے، ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔" ۱۳

رسالہ "گفتگو" کے ترقی پسند ادب نمبر میں اس اعلان نامہ کو "ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے اور نیچے قوسین میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

(انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرس منعقدہ لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء میں منظور ہوا۔ صدر منشی پریم چند) یہ سہو کاتب ہے حقیقتاً یہ دوسری کل ہند کانفرس کلکتہ میں منظور ہوا۔

تجاویز

(دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ء میں منظور)

۱۔ جب تک ہمارا ملک بیرونی سامراجی طاقتوں کا غلام ہے تب تک ہندستان کی کلی طور پر تہذیبی وثقافتی ترقی ممکن نہیں ہے۔ کثیر ہندستانی عوام کی ناخواندگی، آرٹ کے میدان میں اس کی بدترین حالت کے لئے برطانوی سامراجیوں کا استحصال نیز ہندستانی ثقافت کی ترقی کو لے کر برتی جاری اس کی بے توجہی کا رویہ ذمہ دار ہے۔ جو لوگ تہذیب وتمدن سے محبت رکھتے ہیں یہ کانفرنس ان سبھی کا یہ مقدس فریضہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنی تحریر اور اخلاقی اور مادی طاقت سے ہندستانی عوام کی جنگ آزادی میں مدد کریں۔

۲۔ یہ کانفرنس دنیا کے ان ادیبوں اور فنکاروں کے تئیں اپنے اتحاد کا مظاہرہ کرتی ہے جو رجعت پرست فاشزم اور سامراجیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اور ان لوگوں اور انجمنوں کو مبارک باد پیش کرتی ہے جنہوں نے اس کے لئے مصیبتیں جھیلیں، خاص کر جرمنی، اسپین اور چین میں۔ اس کانفرنس کے خیال میں ادب اور آرٹ پوری بنی نوع کی وراثت ہے اسے ذات، نسل، ملک اور جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ ہندستان کے ترقی پسند مصنفین ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو ہر طرح کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہوئے مساوات، آزادی اور امن سے پُر ایک نئے

معاشرتی نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہیں۔ ہم فاشزم اور فوج کی کلچر دشمن طاقتوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہندستانی ادیبوں اور دانشوروں کی یہ کانفرنس عالمی امن کی خواہاں طاقتوں اور اس مقصد میں سرگرم قومی طاقتوں کی مدد کرنے کا فیصلہ لیتی ہے۔

۳۔ یہ کانفرنس کانگریس وزارت کے تحت ہندستانیوں کو چند عوامی آزادی دیئے جانے کا استقبال کرتی ہے اور ساتھ ہی ہندستان کے مختلف صوبوں میں آزادیٔ خیال پر لگی پابندیوں، ہندستانی حکومت کے کسٹم قانون یا مخصوص فرمانوں کے ذریعہ ترقی پسند ادب کے درآمد پر عائد پابندی کی مذمت کرتی ہے۔ یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ اس طرح کی پابندی و بندش ملک کی ثقافتی ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹ ہے۔ یہ کانفرنس ترقی پسند خیالات کی ترویج میں دلچسپی رکھنے والے سبھی لوگوں اور انجمنوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس عمل کے خلاف آواز بلند کریں۔

۴۔ یہ کانفرنس تعلیمی نظام کو پھر سے منظم کرنے اور ناخواندگی ختم کرنے کی سمت میں صوبائی حکومتوں اور دیگر انجمنوں کے ذریعہ کئے جانے والی کوششوں کا استقبال کرتی ہے۔ پھر بھی کانفرنس کا خیال ہے کہ ثقافتی موضوع کے مطالعے کو آزاد خیالی کا خودمختار میدان نہیں مانا جانا چاہئے۔ یہ کانفرنس تعلیمی نظام میں نافذ کئے جانے والے ترقی پسند طریقوں کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کرتی ہے۔ اور صوبائی

حکومتوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ تعلیمی نصاب میں فرقہ واریت، کٹھ ملاپن اور رجعت پرستی کو کسی بھی قسم کی جگہ دینے سے انکار کریں۔ یہ کانفرنس بھی صوبائی زبانوں میں اسکولوں اور کالجوں کے لئے ترقی پسند نصابی کتابیں تیار کرنے کے کام کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اور افسروں کا ذہن اس طرف مبذول کرانا چاہتی ہے کہ وہ اس کام کو قابل لوگوں کے سپرد کریں۔ یہ کانفرنس ہندستان کے بھی پرائمری اسکولوں میں "ہندوستانی" کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جانے کی سفارش کرتی ہے اور انڈین نیشنل کانگریس سے گزارش کرتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں منصوبہ بنانے کے لئے ایک کمیشن کی تشکیل کرے۔[۱۴]

انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا دستور، ۱۹۳۸ء

(پہلی کل ہند کانفرنس میں منظور دستور میں ترمیم و تنسیخ کرکے دوسری کل ہند کانفرنس میں منظور کیا گیا)

۱۔ نام : All India Progessive Writers Association

۲۔ مقصد اور منزل:

انجمن کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(الف) ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ۔

(ب) تہذیبی رجعت پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے ہندستانی آزادی اور بیداری کو حاصل کرنے کے لئے مدد کرنا۔

(ج) ادب اور آرٹ کو عوامی زندگی کی حقیقتوں کے قریب لانا۔

(د) ترقی پسند نظریے کی تنقید کو بڑھاوا دینا جو رجعت پرستی کے خلاف ہو اور ترقی کی خواہش کو تیز کرے۔

(ہ) اظہار خیال کی آزادی کے لئے جنگ کرنا اور ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

۳۔ رکنیت :

جو بھی انجمن کے اغراض و مقاصد سے متفق ہو اور انجمن کو ایک روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کرے وہ فارم پر دستخط کرکے انجمن کا رکن بن سکتا ہے۔

۴۔ انجمن کے مراکز:

مرکزی انجمن میں ہندستان کی اہم زبانوں کی لسانی شاخ اور ان لسانی شاخوں کی مقامی شاخ ہوگی۔ ہندستانی خطہ کو چار حصوں میں تقسیم کرکے مندرجہ ذیل مراکز بنائے جائیں گے۔

(الف) پنجاب، کشمیر اور NWFP کا مرکز — لاہور

(ب) اتر پردیش کا مرکز — لکھنؤ

(ج) بہار کا مرکز — پٹنہ

(د) دلی، مدھیہ پردیش اور راجپوتانہ کا مرکز — دلی

۵۔ آل انڈیا کمیٹی :

(الف) سبھی لسانی اور علاقائی شاخوں کے پانچ پانچ نمائندوں سے ہی ایک آل انڈیا کمیٹی انجمن کا کام انجام دے گی۔

(ب) آل انڈیا کمیٹی کو ممبروں کو نامزد کرنے کا اختیار ہوگا۔ لیکن کمیٹی کی رکنیت سو ممبران سے زائد نہ ہونی چاہئے۔

(ج) آل انڈیا کمیٹی، انجمن کی پالیسی اور اس کی کارگزاریوں کے لئے ذمہ دار ہوگی اور کثیر اللسان اور علاقائی شاخوں کے افعال کی نگرانی کرے گی۔

(د) آل انڈیا کمیٹی کم از کم سال میں ایک نشست کرے گی اور اگر کمیٹی کے ایک تہائی ممبر تحریری مانگ کریں تو بھی کمیٹی کو میٹنگ کرنی ہوگی۔

(ہ) آل انڈیا کمیٹی کی میٹنگوں میں کم سے کم ایک تہائی ممبروں کی موجودگی ضروری ہے۔ میٹنگ کی خبر مقررہ تاریخ سے پندرہ دن قبل دینی ہوگی۔

(و) آل انڈیا کمیٹی ایک جنرل سکریٹری اور ایک ایگزیکیوٹیو کمیٹی کا انتخاب کرے گی جس میں پندرہ سے زیادہ ممبر نہیں ہوں گے۔

۶۔ ایگزیکیوٹیو کمیٹی :

(الف) ایگزیکیوٹیو کمیٹی، آل انڈیا کمیٹی کے ذریعہ طے شدہ پالیسی کے مطابق انجمن کا کام چلائے گی۔

(ب) ایگزیکیوٹیو کمیٹی کم سے کم تین مہینے میں اپنی میٹنگ ضرور کرے گی۔ لیکن اگر کمیٹی کے ایک تہائی ممبر تحریری طور سے چاہیں تو کمیٹی کی میٹنگ کرنی ہوگی۔

(ج) ایگزیکیوٹیو کی میٹنگ میں کم سے کم ایک تہائی ممبروں کی موجودگی ضروری ہے اور معین تاریخ سے سات دن قبل اس کی خبر دینی ہوگی۔ ایمرجنسی میٹنگ کسی بھی وقت بلائی جاسکتی ہے۔

۷۔ جنرل سکریٹری :

(i) جنرل سکریٹری انجمن کے روزمرہ کے کام کرے گا اور ایگزیکیوٹیو کمیٹی کو جواب دہ ہوگا۔

(ii) جنرل سکریٹری، آل انڈیا کمیٹی اور ایگزیکیوٹیو کمیٹی میں رابطہ قائم کرے گا۔

(iii) انجمن کی خط و کتابت اور خزانہ کی ذمہ داری جنرل سکریٹری کی ہوگی۔ وہ آل انڈیا کمیٹی کی میٹنگ میں ایک عام رپورٹ اور سالانہ بجٹ پیش کرے گا۔

(iv) جنرل سکریٹری، آل انڈیا کمیٹی یا ایگزیکیوٹیو کمیٹی کے ذریعہ نامزد ذیلی کمیٹیوں کا ممبر ہوگا۔

۸۔ شاخ :

(i) لسانی اور علاقائی شاخیں اپنے علاقوں میں انجمن کے کام کے لئے ذمہ دار ہونگی۔ وہ اپنی سہ ماہی رپورٹ آل انڈیا ایگزیکیوٹیو میں رکھنے کے لئے جنرل سکریٹری کو بھیجیں گی اور عام سالانہ رپورٹ میں شامل کرنے کے لئے ایک سالانہ رپورٹ ارسال کریں گی۔

(ii) اپنے علاقوں میں مقامی یا ضلع شاخ بنانے کا لسانی اور علاقائی شاخ کو اختیار ہوگا۔ وہ دستور کے مطابق خود اپنے لئے اور مذکور شاخ کے لئے قانون بنا سکتی ہیں۔

(iii) سبھی لسانی یا علاقائی شاخیں اپنی پوری آمدنی میں سے ایک چوتھائی مرکزی دفتر کو بھیجیں گی۔

(iv) لسانی یا علاقائی شاخیں اپنی مقامی یا ضلع کی شاخ سے ان کی کل آمدنی کا پانچواں حصہ لیں گی۔

۹۔ انتخاب :

آل انڈیا کمیٹی، آل انڈیا ایگزیکیوٹیو کمیٹی، صوبائی کمیٹی و مقامی کمیٹی کے انتخابات ہر سال ہونگے۔

۱۰۔ دستور میں ترمیم :

آل انڈیا کمیٹی کو اس دستور میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

تیسری کل ہند کانفرنس، دہلی

(مئی ۱۹۴۲ء)

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ فاشسٹ قوتیں عروج پر تھیں۔ ہٹلر اور مسولینی یورپ میں قہر برپا کئے ہوئے تھا تو ایشیا کے لئے جاپان سر درد بنا ہوا تھا۔ ساری دنیا میں زبردست خوں ریزی اور دہشت گردی جاری تھی۔ کب کس ملک پر حملہ ہو جائے اور کہاں کے عوام محکوم و غلام بنا لئے جائیں اس کی خبر نہ تھی۔ بربریت کا ننگا ناچ ہو رہا تھا ایسے میں امن پسند اور باشعور شہری خواہ وہ کسی بھی ملک، نسل یا مذہب کے ہوں کیوں کر سکون پا سکتے تھے۔

ہندوستان کے بہت سے سیاسی رہنما جن کا تعلق کانگریس یا کمیونسٹ پارٹی سے تھا قید کر لئے گئے تھے۔ ہندوستانی لیڈروں اور عوام کے سامنے بھی ایک عجیب مسئلہ تھا۔ اس عالمی جنگ میں ایک طرف فاشزم، نازی ازم کا علمبردار جرمنی اور اٹلی تھا تو دوسری طرف برطانیہ اور فرانس وغیرہ۔ برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان کے فوجی اور شہری وسائل اس جنگ میں جرمنی کے خلاف اس کی مدد کریں۔ ہندوستانیوں کی مجبوری یہ تھی کہ ایک

طرف پرانا دشمن انگریز ہے جس کے ساتھ وہ آزادی کی لڑائی لڑتے آرہے ہیں تو دوسری طرف فاشزم کا دل دہلا دینے والا علمبردار۔ وہ کس کے ساتھ جائیں۔ اگر وہ جرمنی کے خلاف انگلینڈ (برطانیہ) کی حمایت اور مدد کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی غلامی سے مطمئن ہیں اور اگر برطانیہ کی مدد نہیں کرتے تو اس کا مطلب وہ فاشزم کو آگے بڑھنے کا موقع دے رہے ہیں۔ اس مسئلہ پر ہندوستان کے سیاسی رہنما اور دانشور مختلف خانوں میں تقسیم ہو گئے۔ کانگریس کا نرم دل اس بات کا قائل تھا کہ اس موقع پر ہمیں برطانیہ کی مدد کرنی چاہئے، جس سے خوش ہو کر انگریز ہمیں آزادی دے دیں گے یا پھر حکومت میں ہندوستانیوں کے زیادہ سے زیادہ اشتراک یا حقوق کو قبول کرلیں گے جبکہ کانگریس کا گرم دل یہ چاہتا تھا کہ انگریز خود مجبور ہیں اور ایک مورچے پر زبردست جنگ کر رہے ہیں ایسے موقع کا فائدہ اٹھا کر ہمیں بھی ان پر دباؤ ڈالنا چاہئے۔ وہ ایک ساتھ دو مورچوں پر نہیں لڑ سکتے اور عاجز آ کر ہمیں آزادی دے دیں گے۔ (اس کی انتہا تب ہوگئی جب سبھاش چندر بوس نے برطانوی حکومت سے چھٹکارا پانے کے لئے سامراجی طاقت جاپان سے ہاتھ ملالیا اور آزاد ہند فوج لے کر انگریزوں سے لڑنے چل پڑے) کمیونسٹوں کا موقف بھی کچھ ایسا ہی تھا اور وہ برطانیہ کی مدد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا تو پھر عالمی جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ برطانیہ نے فوراً روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ادھر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے بھی اپنا نظریہ بدل دیا کہ اب سوویت روس برطانیہ کے ساتھ تھا اور سوویت کی حمایت کرنا کمیونسٹ پارٹی کی عقیدت تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی جو ابھی تک برطانیہ کی مخالف تھی جنگ کے مسئلہ پر اس کی ہمنوا ہوگئی۔

برٹش حکومت نے بھی ۱۹۴۱ء میں اپنی پالیسی میں کچھ تبدیلی کی اور جیلوں میں بند بہت سے کانگریسی اور کمیونسٹ رہنما آزاد کیے جانے لگے یہ وہ لوگ تھے جو عالمی جنگ کے آغاز کے بعد وقتاً فوقتاً قید اس بنا پر کیے گئے تھے کہ برطانیہ کے خلاف زہر اگل رہے تھے اور اس کے تسلط سے آزادی چاہتے تھے۔ ان رہا ہونے والوں میں سجاد ظہیر بھی شامل تھے جو کہ

پورے دو سال تک قید تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین اس دور میں تعطل کا شکار رہی۔ دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ جو کہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی، کے بعد سے اب تک کوئی بڑی کانفرنس نہیں ہوئی تھی اور صوبائی تنظیمیں بھی یا تو کمزور ہوگئی تھیں یا ٹوٹ گئی تھیں۔ سجاد ظہیر روشنائی میں لکھتے ہیں کہ:

> "مرکز اور بیشتر صوبائی اور مقامی شاخیں تعطل کی حالت میں تھیں یا ٹوٹ گئی تھیں۔ لکھنے والے موجود تھے اور ترقی پسند ادب کی تخلیق و اشاعت جاری تھی (رسالوں اور کتابوں کے ذریعے) لیکن ان میں ربط اور تنظیم باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جماعتی فکر اور تنقید اور فیصلے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس خودرو کیفیت کو دور کرنا ضروری تھا۔ دوسرا اہم مسئلہ ہمارے سامنے یہ تھا کہ جنگ کی نئی صورتِ حال کی طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کیا رویہ اختیار کرے۔" ۱۵

جب سجاد ظہیر جیل سے رہا ہوئے تو ڈاکٹر عبد العلیم کے ساتھ مل کر کانفرنس کے انعقاد کے لئے تبادلۂ خیال کیا۔ رشید جہاں، سبطِ حسن، سردار جعفری، رضا انصاری، شیودان سنگھ چوہان اور بہت سے ترقی پسندوں کے مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ انجمن جلد از جلد ایک کل ہند کانفرنس کرے اور اپنی تنظیم و تحریک کو پھر سے منظم اور مربوط کرے نیز جنگ کے مسئلے پر ادیبوں، دانشوروں کے آراء کو جانے اور ایک لائحہ عمل بنائے۔

اس کے بعد سجاد ظہیر دہلی گئے جہاں ان کی ملاقات مجاز، کرشن چندر، منٹو، اشک اور ہندی کے ادیب واتسائن وغیرہ سے ہوئی۔ یہ سب بھی مجوزہ کانفرنس کے لئے راضی ہو گئے۔ کرشن چندر نے یہ کانفرنس دہلی میں ہی کرنے کی تجویز رکھی اور سارا انتظام اپنے سر لے لیا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> "اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کرشن چندر نے دہلی کے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر دہلی میں ہی کانفرنس منعقد

کرنے، اس سلسلے میں خط و کتابت کرنے، اس کا انتظام کرنے اور اس کے اخراجات کے لئے چندہ فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔“ ۲۶

غرض کہ تیسری کل ہند کانفرنس مئی ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ دہلی سے کرشن چندر نے دعوت نامے بھیجے اور لکھنؤ سے ڈاکٹر عبد العلیم نے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا جیسا کہ اس وقت لکھنؤ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مرکزی دفتر تھا اس لئے جو دعوت نامے ڈاکٹر عبد العلیم نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے لوگوں کو بھیجا اس پر واضح تھا کہ یہ کانفرنس ترقی پسندوں کی ہے، مگر دہلی سے جو دعوت نامے کرشن چندر نے بھیجے اس میں ترقی پسندی کا ذکر نہیں تھا۔ لہٰذا وہ محض مصنفین کی کانفرنس کے لئے سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کے ادیب و شاعر یکجا ہو گئے اس لئے اس کانفرنس میں دو طرح کے اجلاس کرنے پڑے۔ ایک صرف ترقی پسند مصنفین کا اجلاس اور دوسرا عام مصنفین کا اجلاس جس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں شریک ہوئے۔ جنگ کے مسئلے پر پالیسی طے کرنے کے لئے یہ غلط فہمی بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔

اس کانفرنس کے اجلاس ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں ہوئے۔ اس میں اردو ہندی کے بہت سے ادیب و شاعر شامل ہوئے جن میں سجاد ظہیر، عبد العلیم، کرشن چندر، مولانا صلاح الدین، عبد المجید سالک، میراں جی، قیوم نظر، حفیظ جالندھری، شیودان سنگھ چوہان وغیرہ کے نام ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں۔ جنگ کی حمایت یا مخالفت کی پالیسی کے بارے میں کھلی بحث ہوئی۔ جنگ کی مخالفت میں تجویزیں پیش کی گئیں اور ایک اعلان نامہ بھی منظور ہوا۔

اس کانفرنس کی ایک اہم بات یہ بھی رہی کہ اس میں کوئی تنظیمی انتخابات نہیں کئے گئے۔ رات میں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت مولانا عبد المجید سالک نے کی۔

اعلان نامہ

(تیسری کل ہند کانفرنس، مئی ۱۹۴۲ء)

لڑائی ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئی ہے اور ہندوستان کے بعض ساحلی شہروں پر بم باری بھی ہو چکی ہے۔ جاپان کی سامراجی فوجیں ہمارے ملک پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔ اس جنگ کے پیچھے بین الاقوامی فاشزم کی منظم طاقت کارفرما ہے جو ترقی پسند قوتوں کے ساتھ زندگی یا موت کی جنگ کر رہی ہے۔ ہمارے ملک پر فاشسٹوں کا قبضہ ہو جانے سے نہ صرف ہماری عوام غلام ہو جائے گی بلکہ صدیوں کی کوشش اور محنت سے حاصل ہماری تہذیب و ثقافت، ہماری خودداری اور مستقبل میں متوقع وطنی آزادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ یہ سمجھنا کہ جاپانی یا اور کوئی فاشسٹ حملہ آور اپنی بربریت اور غلط بیانی سے شکار کئے ہوئے ملکوں کی بہ نسبت ہمارے ملک کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا نہ صرف اس کی فوجی منصوبہ بندی کو نظر انداز کرنا ہوگا بلکہ ایک دہائی پر مبنی تاریخی حقائق سے آنکھ چرانا ہوگا۔ اس فاشسٹ سامراجیت کا مقصد صرف پورے ایشیا پر سیاسی تسلط قائم کرنا اور اس کا معاشی استحصال کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی اجتماعی زندگی کو ہمیشہ کے لئے اپنے حصار میں لینے کے لئے ہندوستان کی کلچرل اور دانشورانہ ورثہ کو تباہ کرنا اور عوام کو رفتہ رفتہ تہذیبی زوال کی طرف لے جانا ہے۔ یہ مقصد قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا بے رحمی کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے اور

فاشسٹوں کے چنگل میں آنے والے سبھی ملکوں میں بے دردی کے ساتھ اسے انجام دیا گیا ہے۔ تہذیبی اور تعلیمی اداروں کو چین میں بے دردی سے تباہ کیا گیا ہے۔ مشہور ننکائی یونیورسٹی پر کیے گئے زبردست حملے کو تہذیب و ثقافت پر کیے گئے منظم حملوں کی صرف ایک مثال مانا جا سکتا ہے۔ کوریا میں جاپانی حکمراں قدیم تہذیب و تمدن کو مٹانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور ان تھوڑے سے اسکولوں میں جو اس ملک میں ہیں قومی زبان پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی حال فارموسا کا ہے۔ لوگوں کو وحشی بنانے کے لئے، ان کے انقلابی جذبے کو کچل دینے کے لئے، افیم اور دیگر نشیلی اشیاء کا بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ جاپان کے مغربی دوستوں کے کارنامے اس سے مختلف نہیں ہیں۔ مثلاً سائنسی تعلیم پر پابندی، دانشوروں کو ملک بدر کرنا اور کتابوں کو جلا دینا۔

فاشزم چاہے جاپانی ہو یا جرمن یا اٹیلین، یہ سرمایہ پرستی اور سامراجیت کے بین الاقوامی نظام سے پیدا ہوتی ہے لیکن فاشسٹوں کے وحشی پن اور تہذیب مخالف عمل جرمنی اٹلی یا جاپان کی عوام سے جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہئے اور وہاں کے عوام کی فطرت پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ آرٹ، سائنس اور ادب کے میدان میں ان ملکوں کی باصلاحیت عوام نے جو بہترین کارنامے انجام دیے ہیں ہم ان کی قدر کرتے ہیں مگر آج مٹھی بھر فاشسٹ حکمرانوں نے ان سب کی معاشی زندگی پر قبضہ کر کے، جھوٹے پروپگینڈے کر کے اور موت کا ننگا روپ دکھا کر، ان قوموں کے بہترین جذباتوں اور فطری

خوبیوں کو کچل ڈالا ہے۔ اس لئے فاشزم کے خاتمے کا مطلب صرف بیرونی حملہ آوروں سے تہذیب و ثقافت کی حفاظت کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ان فاشسٹ حاکموں سے ان بے بس قیدیوں کو آزاد کرانا بھی ہے۔ ہم ہندوستانی ادیبوں کا فاشزم سے کوئی اشتراک نہیں ہے۔ ہم جو کہ ہمیشہ انگریزی سامراج شاہی سے ہندوستانی آزادی کے خواہش مند رہے ہیں اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، کبھی اس مقصد سے آنکھ نہیں چرا سکتے اور نہ چرائیں گے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ آج ہندوستان کو سب سے بڑا خطرہ سر پہ منڈلاتے ہوئے فاشزم سے ہے۔ ایسے کسی حملے کی کامیابی کا مطلب ہماری بھی سیاسی خواہشوں کا ختم ہو جانا ہے۔ دوسری طرف فاشزم کی شکست سامراجیت کی تباہی کی پیش خیمہ ہوگی اور ترقی پسند سوویت روس، چین اور دوسرے جمہوری ممالک سے رشتہ جوڑنے میں بہترین امکانات دکھائی پڑ رہے ہیں۔ اس لئے اس مشکل وقت میں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کریں کہ وہ اس غلط فہمی کو دور کریں کہ وہ محفوظ ہیں اور غیر جانب دار رہنے میں بھلائی ہے۔ فاشزم ایک ناآشنا دشمن نہیں ہے۔ تہذیب و ثقافت کی تباہی فاشزم کا لازمی منصوبہ ہے اس سے بے اعتنائی یا اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا مطلب ہے کہ اپنی مرضی سے ایک وحشی حملہ آور کی لبی اور مہلک غلامی کو قبول کرنا۔

ہر ملک میں فاشزم کی فتح نے ترقی پسند تحریکوں اور خیالوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ کلچرل اظہار کے طریقوں کو بند کیا ہے، عوامی

ورثہ کو بربریت کے ساتھ تباہ کیا ہے۔ آج فاشزم کی جیت کا مطلب ہوگا ایک نئے تاریک دور کا آغاز۔ اور اس مصیبت سے بچنے کے لئے ہندوستانی عوام کو اپنا فرض پورا کرنا ہوگا۔ انھیں سوویت یونین کی بہادر عوام، بہادر چینی قوم اور دیگر فاشسٹ مخالف ملکوں کے عوام کا ساتھ دینا ہوگا۔ آج فاشسٹوں کے تسلط کو برداشت کر رہے لوگوں کو بچانا ہوگا۔ ان ملکوں میں فاشسٹ مخالف دانشور اور مزدور بجائے اس کے کہ ان کے ساتھ بد سے بدتر سلوک کیا جا رہا ہے، اپنی زبردست لڑائی لڑ رہے ہیں۔ خود جاپان اور جرمنی میں فاشسٹوں نے ان ملکوں کے سینکڑوں مشہور و مقبول ادیبوں، فنکاروں، سائنسدانوں اور دانشوروں کو یا تو Contresention camp میں ڈال دیا ہے یا ملک بدر کر دیا ہے یا پھانسی تک دے دی ہے۔ خود فاشسٹ ملکوں میں ہونے والے عظیم جدوجہد کے پیچھے یہی روح میں علامت کا کام کر رہی ہیں۔ اس عالمی فاشزم کے خلاف اس مشترکہ جدو جہد میں ہندوستانی عوام الگ نہیں رہ سکتی۔

آج ہمارا فرض ہے کہ ہم فاشسٹ حملہ کے خلاف اپنے وطن کی حفاظت کے لئے عوام کے سینے میں حب وطن کا جذبہ پیدا کریں۔ آج ہمارا فرض ہے کہ ہم فاشزم کی اصل فطرت کا پردہ فاش کریں اور فاشسٹ پروپیگنڈے میں پھنسنے سے اپنی عوام کو بچائیں۔ آج ہمارا فرض ہے کہ ہم ملک میں اتحاد قائم کریں اور مختلف گروہوں کے بیچ کی دوری ختم کریں جس سے قومی حکومت اور ملک کی مکمل حفاظت کا راستہ صاف ہو سکے۔ آج ہمارا فرض ہے کہ ہم پست ہمتی کے خلاف لڑیں اور اپنے ہم وطنوں میں ہر قسم کی بیرونی اقتدار اور حملہ

کے خلاف احتجاج کرنے کا حوصلہ اور عزم پیدا کریں۔ ہم ہندوستان کی شاندار اور بیش بہا تہذیب کے محافظ اور وارث ہیں۔ فاشسٹ لٹیروں سے اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ فاشزم کے خلاف، عوام کو ذہنی طور پر مضبوط بنانے کے لئے ہمیں اپنی تخلیقات کے ذریعہ ان کی مدد کرنی چاہئے۔ کتابوں اور پمفلیٹوں، ریڈیو اور سنیما، گیتوں اور اسٹیج کے ذریعہ ہمیں عوام تک پہنچنا چاہئے۔ اپنے وطن کی پکار پر آگے آنا اور آزادی و تہذیب کے چراغ روشن کرنا ہمارا فرض ہے۔

madblib.org

تجاویز

(تیسری کل ہند کانفرنس ۱۹۴۲ء میں منظور)

۱۔ رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ فاشزم کی اصلیت اور اس کے خلاف تمدن اور بہیمانہ "کارناموں" کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ خاص طور پر یہ دیکھا جائے کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے حکمرانوں نے اپنے مقبوضات میں کس طرح قدیم تہذیب و تمدن کو برباد کر کے ملک والوں کو ذہنی اور مادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

۲۔ نظموں، گیتوں، کہانیوں اور ناٹکوں کے ذریعہ ملک کی حفاظت اور آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ خاص طور پر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے عام فہم زبان اور ممکن ہو تو دیہاتی بولیاں بھی استعمال کی جائیں تا کہ ہماری آواز جنتا تک پہنچ سکے۔ ڈرامے بھی ایسے لکھے جائیں جو عوام کی سمجھ میں آسکیں اور ان کی "نوٹنکی" کی شکل میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ ادیبوں اور طالب علموں کی ایسی ٹولیاں بنائی جائیں جو شہروں اور دیہاتوں میں گھوم گھوم کر جنتا کو سمجھائیں کہ ملک پر کیا نازک وقت آ گیا ہے اور اس وقت قومی اتحاد ہی واحد راستہ ہے۔ اس سلسلے میں پوسٹر اور دیواری خبرناموں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

۴۔ سینما اور ریڈیو کے ذریعہ بھی مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

۵۔ اجتماعی گانے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تحریک چین میں بھی بہت کامیابی سے چل رہی ہے۔ لوگوں میں جوش اور آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر ترکیب نہیں ہو سکتی۔ گانے ایسے ہوں کہ ہزاروں آدمی ایک ساتھ مل کر گا سکیں ہمارے شاعروں کا فرض ہے کہ ایسے گانے تیار کریں اور اس تحریک کو آگے بڑھانے میں حصہ لیں۔

maablib.org

چوتھی کل ہند کانفرنس، بمبئی

(۲۲ر سے ۲۵ر مئی ۱۹۴۳ء)

بمبئی ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ تجارت، صنعت وحرفت اور فلمی دنیا غرضکہ ہر شعبہ میں اس شہر کا بھرپور دخل ہے۔ یہاں پر ہندوستان بھر کے باشندے آپ کو بغرض ملازمت وتجارت مل جائیں گے۔ ۱۹۴۲ء سے اردو کے کئی ادیب وشاعر بھی فلمی دنیا میں گیت اور مکالمے لکھنے کی غرض سے بمبئی آنے شروع ہوگئے تھے۔ چونکہ اپٹا (IPTA) کا تعلق انجمن سے ہی تھا اس لئے اس کے ممبران اور فلمی دنیا کے لوگ بھی کافی تعداد میں یہاں موجود تھے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار وصحافی خواجہ احمد عباس بمبئی میں ''کرانیکل'' اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ جون ۱۹۴۲ء میں سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری بھی کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' کی ادارت کے لئے بمبئی آگئے۔ یہ بھی مل کر خواجہ احمد عباس کے چھوٹے سے کمرے میں اپنی نشستیں کیا کرتے تھے۔ حتی کہ یہ کوئی باضابطہ نشستیں نہ تھیں پھر بھی ایک کارآمد ملاقات ضرور ثابت ہو جایا کرتی تھیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس میں نہ صرف اردو کے بلکہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، کنڑ اور ملیالم کے بھی ادیب شامل ہو جایا

کرتے تھے۔

خواجہ احمد عباس کی کوششوں سے آگے چل کر نشست کے لئے ایک ''بک کلب'' کا انتظام ہوگیا جس میں انجمن کے جلسے باقاعدہ ہونے لگے۔ یہاں پر جو پہلا جلسہ ہوا اور جس میں بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی اس کی صدارت مرہٹی کے مشہور ادیب ماما ورپر کرنے کی تھی۔ اس جلسہ میں تقریباً پچیس تیس لوگ موجود تھے جس میں ماما ورپر کے علاوہ گجراتی کے باکولیش، بھوگی لال گاندھی اور سوپن رستھ، ہندی کے رمیش سنہا، اردو کے سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس اور علی سردار جعفری کا نام اہم ہے۔ انجمن کی تشکیل کے بعد ایکزیکیوٹیو بنائی گئی، ممبر بنائے گئے اور پارسی نوجوان ''گول والا'' کو سکریٹری چنا گیا۔ میرے خیال میں ترقی پسند گروپ میں گول والا پہلا اور آخری شخص ہے جس نے ترقی پسندی کو اپنے خون سے سینچا (گول والا کو چھرا مار کر قتل کر دیا گیا تھا)۔ بمبئی کی اس انجمن نے مسلسل پابندی کے ساتھ کئی جلسے کیے اس کی روداد ہفتہ وار ''نظام'' میں جو کہ قدوس صہبائی کا اخبار تھا، شائع ہوئی تھی۔ اس انجمن نے جو کئی اہم جلسے کیے وہ جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، جگر مرادآبادی، ای۔ ایم۔ فوسٹر، مولوی عبدالحق، ڈی۔ پی۔ مکھرجی، سبھدرا کماری چوہان، اودے شنکر وغیرہ سے متعلق تھے۔ اب یہ جلسے بک کلب کے بجائے سجاد ظہیر کے اپنے فلیٹ پر ہوا کرتے تھے۔

غرض کہ بمبئی میں مختلف زبانوں کے اور خاص کر اردو کے بہت سارے مشہور و مقبول ادیب و شاعر اکٹھا ہو گئے تھے۔ کل ہند کانفرنس کے لئے اب بمبئی ایک مناسب جگہ تھی۔ لہٰذا چوتھی کل ہند کانفرنس ۲۲ سے ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء تک بمبئی میں چوپاٹی کے قریب سینٹ ہرسٹ روڈ پر واقع مارواڑی ہائی اسکول میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جنوبی ہند سے بھی خاص تعداد میں مندوبین شریک ہوئے کیونکہ نسبتاً شمالی ہند (لکھنؤ، کلکتہ اور دہلی جہاں پر پہلی تینوں کل ہند کانفرنسیں ہوئی تھیں) کے بمبئی آنا لوگوں کے لئے قدرے آسان تھا۔ لکھنؤ سے

ڈاکٹر عبدالعلیم (جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین)، اسرار الحق مجاز اور رضا انصاری کانفرنس میں شریک ہوئے۔ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، سبط حسن اور کرشن چندر وغیرہ بمبئی میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ حیدر آباد سے مخدوم محی الدین اور ان کے بہت سے ساتھی کانفرنس میں شریک ہوئے، یہ کانفرنس بھی دوسری عالمی جنگ کے درمیان ہی ہو رہی تھی اس لئے اس میں بھی جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل پر، ادیبوں کے جانب دار یا غیر جانب دار رہنے کے سوال پر، ایسے پر آشوب دور میں ادیبوں اور شاعروں کے رول پر اور آگے کی پالیسی طے کرنے پر بھرپور گفتگو ہوئی۔

اس کانفرنس کی مجلس صدارت میں اردو کے جوش ملیح آبادی مراٹھی کے ایس. اے. ڈانگے، ہندی کے راہل سنکرا تیاین، بنگالی کے ستیندر ناتھ موجمدار، گجراتی کے جیتو بھائی اور تیلگو کے پچپائیاں وغیرہ شامل تھے۔ مراٹھی ادیب و مورخ ایس. اے. ڈانگے نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ:

> ”دوستو! آج ہم لوگ ایسے موقع پر جمع ہوئے ہیں جب پوری انسانیت خطرناک اور مہلک عالمی جنگ سے دوچار ہے۔ آپ مورچے پر لڑ رہے ہوں یا اپنے گھر کی چہار دیواری میں قید ہوں، چاہے آپ بچے ہوں، نوجوان ہوں، بوڑھے ہوں، مرد ہوں یا عورت، آپ کی زندگی اس جنگ سے متاثر ضرور ہوتی ہے.......
>
> ......ادیب، قوم اور عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، اس کا ہم نوا ہوتا ہے، اسے متحرک کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس جنگ کے مسئلہ پر غیر جانب دار اور خاموش نہیں رہ سکتے۔ انسانی تاریخ کے کسی بھی عہد کو دیکھئے اس عہد کے ادیب و دانشور جو عوام کے ساتھ تھے انہیں کی طرح رہتے اور سوچتے تھے۔ ان کے جذبوں کو محسوس کرتے تھے اور

کبھی بھی وہ اپنے آپ کو تکلیف دہ اور بربر جنگوں سے الگ نہیں رکھ سکے۔ ایسے موقعوں پر اس عہد کے عظیم فنکاروں نے جنگ کے مسئلے پر غور و فکر کیا، ایثار و قربانی سے پُر تحریر و تقریر پیش کیا۔ جیسا کہ ہمارے ان سلفاء نے کیا یا ہمارے ہم عصر کر رہے ہیں، ہمارے سامنے بھی اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔" ١٧

جوش ملیح آبادی نے کہا کہ:

"ادیب و شاعر پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیے۔ ہماری ادبی انجمنوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو صرف اغراض و مقاصد بتائیں اور ادیب و شاعر کو اس بات کے لئے آزاد چھوڑ دیں کہ وہ ان اغراض و مقاصد کو اپنے طریقے سے پیش کریں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے جو مقاصد اپنے سامنے رکھے ہیں وہ بہت ہی عمدہ اور کارآمد ہیں اس لئے کوئی بھی ایماندار ادیب و شاعر و فنکار اس سے انکار نہیں کر سکتا۔" ١٨

اس کانفرنس میں کئی اہم قراردادیں پاس ہوئیں اور ایک اعلان نامہ بھی منظور ہوا جو کہ آگے درج ہے۔ چونکہ تیسری کل ہند کانفرنس، دہلی میں کوئی انتخاب نہیں ہوا تھا اس لئے یہاں یہ بھی فریضہ پورا ہوا۔ انجمن کا مرکز لکھنؤ سے بمبئی منتقل کر دیا گیا اور ڈاکٹر عبدالعلیم کی جگہ سجاد ظہیر پھر سے انجمن کے جنرل سکریٹری بنا دیے گئے۔ خواجہ احمد عباس اور رشنوڈے جوائنٹ سکریٹری، اور ماما ورے رکر خازن منتخب ہوئے۔ انجمن کی نئی مجلسِ عاملہ کا بھی انتخاب ہوا۔

٢٥ مئی کی رات ایک سنیما ہال میں مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں اردو ہندی کے شاعروں اور کویوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ اردو کے شاعروں میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، اسرارالحق مجاز، سردار جعفری وغیرہ نے شرکت کی۔ مشاعرے میں شرکت کے لئے ٹکٹ لگا دیا گیا جس کی وجہ سے اچھی خاصی آمدنی بھی ہوگئی جس سے اخراجات پورے کیے گئے۔

اعلان نامہ

(چوتھی کل ہند کانفرنس، بمبئی، ۲۲ر۔۲۵رمئی ۱۹۴۳ء)

اس سخت بحرانی دور میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کا سب سے اہم فرض ہے کہ وہ قوم کے عزم واستقلال کو حوصلہ بخشیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کے حوصلے اور عہد کو مضبوط بنائیں تاکہ ہماری آزادی کا دن نزدیک آئے۔ ہماری تہذیب اور ثقافت برقرار رہے، اس کی ترقی ہو اور ہم اس مشکل وقت سے آزاد، طاقت ور اور متحد ہو کر نکل سکیں۔

ترقی پسند مصنفین ہمیشہ سے ہی ہندوستان کی آزادی اور ملک میں ایک منصفانہ سماجی اور معاشی نظام کے قیام کے لئے لڑتے رہے ہیں۔ یہی نہیں، انھوں نے ہر طرح کی سماجی رجعت پرستی اور تنزل پسند خیالات کے خلاف جنگ کیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کو انھوں نے عالمی آزادی کے ایک جز کی شکل میں دیکھا اور سمجھا ہے۔ اور جہاں انھوں نے عوام کو ہر قسم کی سامراجی طاقتوں کے غلبے سے آزاد ہونے اور حقوق کی حفاظت کرنے کا اعلان کیا ہے وہیں انھوں نے فاشزم کی بھی مخالفت کی ہے جو سامراجی طاقتوں کی ہی ایک خوفناک شکل ہے۔

جس وقت ہماری یہ قدیم اور پیاری دنیا شکست وریخت میں مبتلا ہو اور اتنے دنوں سے قبول کیے ہوئے اعتقادات کی پھر سے قیامِ نو کی ضرورت ہو، اگر ادیب اپنی زندگی کے عمل کے تئیں

ایماندار رہنا چاہتا ہے تو اسے عوام سے رشتہ جوڑنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ادبی تخلیق ایک مشکل عمل ہے۔ جس کی قدیم ترین اور عجیب روایتیں ہیں۔ نہ اس کا یہی مطلب ہے کہ ہم اس مغالطے میں پڑ جائیں کہ حکم دے دینے سے ہی نئی پختہ ثقافتیں تیار ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب سماج مصیبت زدہ ہو، جب وہ اپنی زندگی اور موت کی جدوجہد سے گزر رہا ہو تب ادیب کو بذات خود اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے شیش محل سے باہر نکل آنا چاہئے۔ اگر ہم صرف چند منتخب لوگوں کو ہی تہذیبی وثقافتی وراثت کا محافظ سمجھیں گے تو جیسا کہ فاشزم کے زیر اثر ان ملکوں میں ہوا جو اس کے آہنی جوتوں کے تلے کچلے جا چکے ہیں یہاں بھی ناانصافی اور ظلم کی طاقتیں انھیں ضرور ہی حیوانی طریقوں سے زبردستی اپنے ماتحت کر لیں گی، سوویت کی مثال ہمیں بتاتی ہے کہ انقلاب کس طرح عزت، فخر اور تہذیب کو عوام کا اثاثہ بنانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ہمارا ملک اپنی تاریخ کے سب سے بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف تو ظالم اور غیر ملکی سامراجی حکومت عوام کے ہاتھ میں طاقت دینے سے انکار کر رہی ہے تو دوسری طرف خونخوار لٹیرا، جاپانی فاشزم ہمارے مشرقی سرحد پر حملہ کر رہا ہے۔ ہزاروں ہندوستانی محب وطن جیلوں میں قید ہیں۔ فاشسٹ آسام اور بنگال پر بم باری کر رہے ہیں۔ اناج اور لباس کی دن بدن کمی ہوتی جا رہی ہے۔ کاغذ، کتاب اور اخبار چھاپنے کے لئے بھی ضروری چیزوں کی

سخت کی ہے جس کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو ہماری تہذیبی وثقافتی ترقی کے لئے بیحد خطرناک ہیں۔ صنعت درہم برہم ہے۔ ہمارے سماج کے معاشی نظام میں انتشار پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین، رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کی عظیم انسانیت نواز اور حریت پسند روایت کے وارث ہیں۔ آج وہ اپنی قوم کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں دنیا کے بھی ملکوں کو آمریت اور فاشزم کے خطرے سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ ہم سوویت اور چین کے ادیبوں کی جانب عزت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی بہادر قوم (عوام) کے ساتھ ساتھ اس سخت جان فاشزم کے خلاف جنگ کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر رہے ہیں اور اس تکلیف دہ جنگ میں شامل ہو کر فخر اور خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ اس تاریک وقت میں بھی وہ فن وادب کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ ہم بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ ہم بھی اپنے ملک کی آزادی اور اتحاد کے پیغام کو اپنے ملک کے باشندوں تک پہنچائیں گے اور ان کے اندر ان کی اپنی ہی طاقت میں یقین پیدا کرنے کی لگاتار کوشش کریں گے۔ آج ترقی پسندی کا کوئی اور مطلب نہیں ہے۔ جب انسانی معاشرہ کی بنیاد ہی خطرے میں ہو، جب اس کے پورے مستقبل کے تاریک ہو جانے کا اندیشہ ہو، جب فاشزم زندگی میں جو کچھ بھی اچھا، کارآمد اور خوبصورت ہے اسے ختم کرنے کے لئے اپنا آخری حملہ کر رہا ہو اور جب رجعت پرست، سرمایہ دار طبقہ ہمارے ملک کے باشندوں کی آزادی اور اتحاد کی خواہش پر چابک لگا رہا ہو

تب ترقی پسندی کو ہر آدمی تک امید و آزادی کا پیغام لے جانا چاہئے اور اعلان کر دینا چاہئے کہ جو قوم آزادی پانے کے لئے متحد ہو جائے گی اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

ان عام مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کو مندرجہ ذیل چند اہم باتیں ضرور عمل میں لانا چاہئے۔

۱۔ چھوٹے چھوٹے ڈراموں، افسانوں، نظموں اور گیتوں کی تخلیق کرنا جن میں سرمایہ داروں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے اور جاپانی حملہ آوروں سے اپنے ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قومی اتحاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا ہو۔

۲۔ غیر ملکی ترقی پسند تخلیقات خاص کر سوویت اور چینی ادب کا ترجمہ اور تبلیغ و اشاعت کرنی چاہئے۔

۳۔ وقت بہ وقت ایک خاص مدت میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی اہم تخلیقات کا انگریزی میں مجموعہ نکالنا چاہئے۔

۴۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترقی پسند ادب کے مجموعوں اور رسالوں کو شائع کرنا چاہئے۔

۵۔ مزدوروں اور کسانوں کے درمیان ادبی و ثقافتی جلسوں کا انعقاد کرنا چاہئے نیز انجمن ترقی پسند مصنفین کو لوک ادب اور آرٹ سے تعلق بنانا چاہئے۔

۶۔ اپٹا (IPTA) کے تعاون سے ایسے ڈراموں کی تخلیق کرنی چاہئے جنھیں اپٹا کے لوگ کھیل سکیں۔[19]

کل ہند کانفرنس (اردو)، حیدر آباد

اکتوبر ۱۹۳۵ء

ابھی تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں ہندوستان کے مختلف زبانوں کے ادیب و شاعر جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے صوبائی ولسانی طبقے کی نمائندگی کرتے تھے مگر یہ پہلی دفعہ ہوا کہ حیدر آباد کی انجمن کی تجویز پر مرکزی کمیٹی نے صرف اردو کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی۔ چونکہ اردو بولنے اور سمجھنے والے عوام نیز اردو کے ادیب و شاعر پورے ہندوستان میں بکھرے ہوئے تھے (ہیں) اور اردو کی انجمن کی شاخ سیکڑوں جگہ قائم تھی لہٰذا اردو کے بھی مصنفین کسی صوبائی یا علاقائی کانفرنس میں یکجا نہیں ہو سکتے تھے اس لئے صرف اردو والوں کی ایک کل ہند کانفرنس کرنا ایک اہم قدم تھا۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں لکھا ہے کہ :

> "حیدر آباد کی انجمن نے مرکز کے سامنے تجویز پیش کی کہ اردو کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کل ہند کانفرنس کی جائے اور اگر مرکز اسے منظور کرے اور حیدر آباد کی انجمن کے ساتھ تعاون کرے تو وہ اس

کانفرنس کو حیدرآباد میں منعقد کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس تجویز پر بمبئی میں آپس میں مشورہ کیا اور دوسری شاخوں کی بھی اس کے متعلق رائے لی۔ ابھی تک ہم نے کسی ایک زبان کی 'کل ہند' کانفرنس نہیں کی تھی۔" ۲۰

اردو کی یہ کل ہند کانفرنس پانچ روزہ تھی۔ کانفرنس کا افتتاح مسز سروجنی نائڈو نے کیا تھا اور افتتاحی جلسے کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ صدارتی مجلس میں کرشن چندر کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تاراچند، فراق گورکھپوری اور احتشام حسین شامل تھے۔ افتتاحی جلسے میں شرکا کی تعداد تقریباً دو ڈھائی ہزار تھی۔ کرشن چندر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ :

" ترقی پسندوں کی تحریک کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ پڑھے لکھے درمیانہ طبقہ میں فرقہ پرستی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے اور بہت سے وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو آزادی خواہ سمجھتے ہیں، انگریزوں سے پہلے اپنے ہم وطنوں سے لڑنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ سیاسی حقیقت بینی کے فقدان کے ساتھ ساتھ معمولی انسانیت اور معمولی شرافت تک کو بھلا دینا ان لوگوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں جہاں انسانیت کی بنیادی قدروں اور ابتدائی مفروضات کو پیروں سے کچلا جائے۔ ترقی پسند ادیبوں کا کام بہت دشوار ہو جائے گا اور انہیں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" ۲۱

اس کانفرنس میں جو دوسرے اجلاس ہوئے ان میں فراق گورکھپوری نے 'جدید اردو شاعری' کے جلسے کی صدارت کی، قاضی عبدالغفار نے 'جرنلزم' کے اجلاس کی، ڈاکٹر تارا چند نے 'اردو ہندی کے مسئلے' پر ہونے والے اجلاس کی، کرشن چندر نے 'افسانہ اور ناول' کے

اجلاس کی، احتشام حسین نے 'اردو تنقید' کے اجلاس کی اور مولانا حسرت موہانی نے 'مشترکہ طور پر ایک بڑے عوامی جلسے' کی صدارت کی۔

حیدرآباد کی اسی کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی تھی۔ جس اجلاس میں یہ قرارداد پیش ہوئی اور اس کی تائید ہوئی اس کی صدارت سید احتشام حسین کر رہے تھے۔ جب انھوں نے حاضرین سے پوچھا کہ کیا کسی کو کوئی اعتراض ہے تو مولانا حسرت موہانی اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس قرارداد میں ایک ترمیم چاہی۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ:

> "علیم نے جو قرارداد پیش کی تھی اس میں کچھ اس طرح کے الفاظ تھے (کہ) یہ کانفرنس ایک بار پھر اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب، ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں اور اسے برا سمجھتے ہیں۔ مولانا موہانی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس جملہ کے آگے یہ جملہ بڑھا دیا جائے 'لیکن وہ لطیف ہوسنا کی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔' مولانا کی اس ترمیم پر سارے حاضرین ہنس پڑے لیکن مولانا پر اس استہزا کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ پوری متانت اور سنجیدگی سے اپنی ترمیم کو منظور کروانے کے لیے تقریر کرنے لگے...... علیم، قاضی عبدالغفار صاحب سے، مجھ سے اور چند دوستوں سے مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ مولانا کی ترمیم اگر منظور کر لی جائے اور اسے قرارداد میں جوڑ دیا جائے تو ملک کے سارے ادبی حلقوں میں تضحیک و مذاق کا سب سے بڑا موضوع ہوگا۔ ترقی پسند ادیب فحاشی کے خلاف ہیں لیکن لطیف ہوسنا کی میں کوئی مضائقہ نہیں، اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے؟...... اب

قاضی عبدالغفار، علیم اور میں مولانا کو سمجھا رہے تھے لیکن وہ اپنی پوزیشن سے ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے......... آخرکار عاجز ہو کر عبدالغفار صاحب کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ اصلی قرارداد فی الحال واپس لے لی جائے۔'' ۴۲

اور اس طرح فحاشی کے خلاف قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ کرشن چندر نے اسی واقعہ کو اپنے مشہور رپورتاژ ''پودے'' میں اس طرح لکھا ہے :

''جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی اور ان کی تخیل نمو رک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پُر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سبط بے حد ناخوش تھا کہنے لگا ''اماں، مولانا کا ہمیشہ یہی رول رہا ہے وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔'' ۴۳

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کانفرنس سے پہلے لکھنؤ میں ''مداوا'' نام کا ایک رسالہ شائع ہوا تھا جس میں گمنام ادیبوں کے علاوہ کچھ معروف و مستند ادیبوں کے مضامین بھی شامل تھے۔ اس پرچہ میں ترقی پسندوں اور ترقی پسندی پر فحاشی، فن سے بے اعتنائی وغیرہ کا الزام زور و شور سے عائد کیا گیا تھا اسی لئے اس کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اس کل ہند (اردو) کانفرنس میں فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کر دیں اور معترضین کو بتا دیں کہ ترقی پسند ادیب فحاشی کو پسند نہیں کرتے۔ لکھنؤ سے آئے ہوئے سید احتشام حسین، ڈاکٹر

عبدالعلیم و دیگر ادیب اس مسئلہ کو لے کر سنجیدہ تھے مگر مولانا حسرت موہانی کی ضد کی وجہ سے یہ قرارداد واپس لے لی گئی۔ اس کے علاوہ 'عداوت' کے مضامین کے جوابات ترقی پسندوں نے مختلف رسالوں میں دیے جس میں سے ایک مضمون اکتوبر ۱۹۳۸ء کے "نیا ادب اور کلیم" رسالہ میں 'سراج مبین' کے عنوان سے چھپا جس کے خالق سجاد ظہیر تھے۔

اس کانفرنس میں سجاد ظہیر نے "اردو، ہندی اور ہندوستانی" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جب کہ احتشام حسین نے اردو کی ترقی پسند تنقید پر، ساحر لدھیانوی نے اردو کی جدید انقلابی شاعری پر اور سردار جعفری نے اقبال کی شاعری اور فلسفے پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر نے ایک اور مقالہ بھی پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا "ترقی پسند ادب کی تحریک"۔ اس مقالے میں انھوں نے کہا کہ :

> "یہاں پر میں ایک دو باتیں صاف کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ پہلے تو یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند رجحان پیدا ہونا انجمن ترقی پسند مصنفین کا کارنامہ ہے۔ انجمن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا مہمل اور غلط ہوتا۔ اگر ہم ترقی پسندی کے وسیع ترین پہلو پر نظر ڈالیں تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ تمام تر اچھا ادب ترقی پسند ہی ہے اور اس طرح سے ہر ایک دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ پھر بھی حالات کی تبدیلی، انسانوں کی زندگی اور اس لئے ان کے ادب میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ مثلاً زوال پذیر سلطنت مغلیہ کا دور میر تقی میر جیسا یگانۂ روزگار پیدا کر سکتا تھا اور اقبال کی لافانی عظمت دور حاضر سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اردو میں جدید ترقی پسندی کی ابتدا نظم میں حالیؔ، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبالؔ، ظفر علی خاں وغیرہ اور نثر میں سرسید احمد، نذیر

احمد، حالی، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد وغیرہ نے کی۔ افسانہ نویسی میں منشی پریم چند نے نہ صرف اردو میں ترقی پسند افسانے کی ابتدا کی بلکہ ابھی تک ہماری زبان میں کوئی دوسرا ترقی پسند افسانہ نگار ان سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ سوال کریں کہ جب سرسید احمد اور مولانا شبلی کے سیاسی، مذہبی اور سماجی خیالات میں بہت فرق ہے تو پھر ان دونوں کو بیک وقت ترقی پسند کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترقی پسندی کے تقاضے ہر زمانے اور ہر عہد میں مختلف ہوتے ہیں۔ سچا ترقی پسند وہ ہے جو حالات کی تبدیلی کو محسوس کرے، ان قوتوں کی ماہیت کو سمجھے جو جماعت اور فرد پر اثر انداز ہو رہی ہیں، اور پھر اپنے عمل سے ان دونوں کو اس انداز سے متحرک کرے جس کا تقاضا تاریخی حالات خود کر رہے ہوں۔ سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے حالات اور ان کی ضروریات کو صحیح طور سے سمجھا، قوم کے سامنے اس کی مشکلات کا حل پیش کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عمل سے ایک ایسی تحریک قائم کر دی جس کی کامیابی نے خود ثابت کر دیا کہ ان کا مجوزہ راستہ درست تھا اور ان کو کافر و ملحد کہنے والوں کا غلط۔

لیکن اگر آج کے حالات میں مسلمانوں کا کوئی رہنما یہ تلقین کرے کہ انھیں آزادی کا مطالبہ نہ کرنا چاہئے اور برطانیہ کے زیر سایہ ہی زندگی بسر کر کے وہ فلاح و بہبود حاصل کر سکتے ہیں، تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ وہ سخت رجعت پرست اور قوم کا

دشمن ہے۔ پھر بھی اردو کے ترقی پسند ادب کے خزانہ میں 'تہذیب الاخلاق' اور 'مسدس حالی' کی بہت بڑی جگہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

شبلی کی عظمت کا راز کیا ہے؟ وہ مسلمانانِ ہند کی تہذیبی زندگی کے اس موڑ کے راہنما ہیں جہاں پر سرسید کا بتایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور وہ شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے جس پر ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مختار احمد انصاری اور خود علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں۔ ان کی 'الفاروق' نے ہمیں کیا سکھایا؟ یہ کہ اس غلامستانِ ہند میں اپنا سر اونچا کر کے چلو، یہ کہ امارت وملوکیت غیر فطری وغیر الٰہی چیزیں ہیں، یہ ہماری بہترین روایات ہمیں اخوت ومساوات وحریت کا سبق دیتی ہیں اور یہ کہ ہماری منزل جمہوریت ہے۔

شبلی نے اسلامی تاریخ کو اپنی قوم کے سامنے اس جوش وخروش کے ساتھ پیش کیا اور اس مقصد کے ماتحت پیش کیا کہ وہ مسلمانوں کو متحرک کر سکے اور ان کے لئے تمدن وسیاست کی صحیح راہ دریافت کرنے میں مددگار ثابت ہو۔" ۲۴

پھر سجاد ظہیر نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ضرورت کیوں کر ہے جبکہ ترقی پسند ادب ہر دور میں تخلیق پاتا رہا۔

"بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی اور جب حالی، شبلی، اقبال بھی ترقی پسند ہیں تو پھر آخر ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ سوال ایسا ہے کہ دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک پھول کھلتے

رہے ہیں تو بانغ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس انجمن کی ضرورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی جس وجہ سے تمام دوسری انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ افراد اجتماعی طور سے ادبی مسائل پر گفتگو اور بحث کریں، فرد اور جماعت کی ضروریات کو سمجھیں، سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ کیا یہ اجتماعی کوشش انفرادی کوشش سے بہتر نہ ہوگی؟" ۲۵

اسی مقالہ میں سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک پر لگائے جانے والے فحاشی کے الزامات کی تردید کی اور کہا کہ:

"حال میں ایک کتاب 'مداوا' کے نام سے لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے اس میں ترقی پسند مصنفین کی ذات اور ترقی پسند ادب کی تحریک پر اسی طرح بے لگام ہو کر حملے کیے گئے ہیں کہ "اودھ پنچ" کا وہ دور یاد آجاتا ہے جبکہ اس کا کام صرف اقبال کے کلام کی غلطیاں نکال کر مرحوم پر فحش حملے کرنا رہ گیا تھا۔ ان گمنام جہلا کا سب سے اچھا جواب خاموشی ہوتا اگر بعض محترم بزرگ ان کے دام تزویر میں گرفتار نہ ہو گئے ہوتے۔ مثلاً مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ میرے عزیز دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب شاید ہی ترقی پسند ادب کے ان اندھے مخالفوں کی صف میں بیٹھ کر اپنی توہین کے روادار ہوتے، اگر انھیں چند غلط فہمیاں نہ ہوتیں جو ایسی ہیں جن کا ازالہ فی الفور کیا جا سکتا ہے...... کیا یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند ادیب فحاشی کرتے ہیں؟ فحاشی ہے کیا؟ اس کلام کو فحش کہا جا سکتا ہے جو انسانوں کی جنسی خواہشات کو اس بری طرح برانگیختہ کرے کہ اخلاقی

اعتبار سے افراد اور سماج دونوں کے لیے مضرر رساں ہو۔ اب اگر ہم ترقی پسند ادیبوں کی شاعری اور افسانہ نگاری کا مجموعی حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں تو حقیقت بالکل اس کے برخلاف ہے۔ نہ صرف یہ کہ فحاشی ترقی پسندوں کا مقصد کبھی تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ یہ کہ انھوں نے تو بالخصوص سماج کی ان اخلاقی کمزوریوں اور پستیوں کا تجزیہ کیا ہے جن کی طرف سے ہمارے اکثر ادیب چشم پوشی کرتے تھے۔ میں آپ سے التجا کروں گا کہ جب آپ کسی ادیب کی صلاحیتوں کا جائزہ لیں تو اس کی تحریروں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں۔ آپ جب حضرت میر تقی میر کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہیں تو یہ نہیں کرتے کہ ان کے سب سے خراب اور سب سے کمزور اشعار کا انتخاب کر کے اعلان کر دیں کہ میر فحش نگار تھے یا یہ کہ وہ اچھے شاعر نہ تھے۔ آپ ان کے بہتر نشتر چنتے ہیں اور انھیں پڑھ کر سر دھنتے ہیں، اسی طرح سے بعض ایسے افسانہ نگار اور شاعر ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں بیک وقت کئی رجحانات ملتے ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو، یہ اردو کے نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اور میں کہوں گا کہ ان کے چند افسانے ہمارے ادب کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے بعض افسانے خراب ہیں بعض رجعت پسند تک ہیں۔ میں نے خود منٹو صاحب سے ایک مرتبہ ان کے افسانے 'بو' کے متعلق یہ کہا کہ آپ کا یہ افسانہ ایک بہت ہی دردناک لیکن فضول افسانہ ہے اس لئے کہ درمیانی طبقے کے ہر ایک آسودہ حال فرد کی جنسی بدعنوانیوں کا تذکرہ چاہے وہ کتنا ہی حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں

کے لیے تضیع اوقات ہے اور دراصل وہ زندگی کے اہم ترین تقاضوں سے اسی قدر فرار کا اظہار ہے جتنا کہ قدیم قسم کی رجعت پسندی۔"۲۷
پھر انھوں نے ترقی پسندوں کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"آپ یہ ہرگز خیال مت فرمایئے گا کہ یہ سب کچھ کہہ کر میں ترقی پسندوں کی لغزشوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہوں۔ ترقی پسند نقاد بغیر کسی رورعایت کے خود ترقی پسند ادب کی کمزوریوں کو ظاہر کر کے تحریک کو بہتر اور مضبوط بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فنی اعتبار سے اپنے کلام میں پختگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ زبانی جمع وخرچ ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی اور عمل سے بھی ترقی پسندی کا ثبوت دیکر آزادروی، ایثار وقربانی کا نمونہ پیش کریں۔ اپنی علمی استعداد میں برابر اضافہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اپنی قدیم ادبی و تہذیبی وراثت کا احترام کریں اور اس سے پوری طرح مستفید ہوں۔ آزادیِ وطن کی تحریک سے ملحق رہیں۔ عوام کے دکھ سکھ کے شریک بنیں، جمہوریت کا دامن کبھی نہ چھوڑیں، مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنی قوم پر اعتماد اور بھروسہ رکھیں۔ مایوسی، حزن، ملال کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ واقعات وحالات کے سطحی مظاہرہ سے گزر کر ان کی اندرونی کیفیت وماہیت دریافت کرنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گویا اس طرح حیات کے سرچشموں تک پہنچیں۔ خود سیراب ہوں اور اپنی قوم کی روحانی تشنگی دور کر کے اس کے بہترین جوہر کو ابھاریں، اس کے نفس کا تزکیہ کریں اور اس کے قصر ایمان و

عمل کے باہمت معمار ہیں۔" ۲۷

آخر میں انھوں نے اس الزام کی طرف اشارہ کیا جس میں کہا جاتا ہے کہ انجمن اشتراکیت کی مبلغ ہے، اس کی تردید کرتے ہوئے کہا:

"اب رہ گیا یہ سوال کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ سے اشتراکیت پھیلائی جاتی ہے۔ تو یہ صحیح نہیں ہے۔ بحیثیت اس کے جنرل سکریٹری کے میں آپ سے اطلاعاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس انجمن کے ممبروں اور ہمدردوں کی بہت بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اشتراکی تحریک سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض کمیونسٹ اس انجمن میں شریک ہیں لیکن ان کی مجموعی تعداد مشکل سے پانچ فیصد ہوگی۔ اصلی صورت تو یہ ہے کہ بہت سے ترقی پسند مصنفین ایسی چیزیں لکھتے ہیں جن میں اشتراکی مصنف اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے معترض ہوتے ہیں۔ اس انجمن میں ہر مذہب وملت ومشرب کے وہ تمام ادیب شامل ہیں یا ہوسکتے ہیں جو اس کے ان مقاصد کو قبول کرلیں جن کا ذکر انجمن کے اعلان نامہ میں کیا گیا ہے۔" ۲۸

اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں قاضی عبدالغفار، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، سید احتشام حسین، سردار جعفری، کرشن چندر، مہیندر ناتھ، مدن گوپال، سبط حسن، رفعت سروش، کیفی اعظمی، قدوس صہبائی، مسلم ضیائی اور عادل رشید وغیرہ تھے۔ حیدرآباد میں اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے جس شخص نے اپنا خون جگر صرف کیا وہ ابراہیم جلیس کے بھائی جگر حیدرآبادی تھے۔ اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کرشن چندر نے جو افتتاحی خطبہ پڑھا تھا وہ آگے درج ہے۔

کرشن چندر کا خطبہ صدارت

(کل ہند کانفرنس اردو، حیدرآباد اکتوبر ۱۹۴۵ء میں پڑھا گیا)

ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس ایک نہایت نازک مرحلہ پر ہو رہی ہے۔ جنگ ختم ہو چکی ہے اور زمانہ مابعد جنگ کے تمام دقیق مسائل الجھے پڑے ہیں۔ میں اس موقع پر اس بنیادی سوال سے بحث نہیں کروں گا کہ ایک ادیب کو ان مسائل کو سلجھانے سے کیا حاصل ہے یا اسے اس قسم کے جھگڑوں سے کیا سروکار۔ چونکہ یہ کانفرنس اپنے ساتھیوں کے لئے ہے، اس لئے میں اپنے لئے اور آپ کے لئے بھی ترقی پسند ادب کی تمام مبادیات کو قبول کئے لیتا ہوں۔ یہ کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور جب زندگی اور اس کے شواہد و عوامل بدلتے ہیں تو ادب بھی بدل جاتا ہے۔ یہ کہ ادب اور سیاست الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ کہ ہر ادب مقصدی اور افادی ہوتا ہے۔ وہ کس مقصد کے لئے لکھا جاتا ہے اور اس کا فائدہ کن جماعتوں کو پہنچتا ہے۔ یہ ادیب کی ذہنی افتادِ طبع اور اس کے جماعتی رجحان پر منحصر ہے۔ یہ کہ جس طرح اقتصادی اور سماجی اور معاشی ادارے نظام زندگی میں بنیادی اختلافات پیدا کرتے ہیں اسی طرح وہ ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور مختلف ادبی جماعتوں کو وجود میں لاتے ہیں۔ وہ جماعتیں جو ادب میں ایسی زبان استعمال کرتی ہیں جو عوام سے کوسوں دور ہے، وہ جماعتیں جاگیردارانہ نظام زندگی کے بچے کھچے عناصر کے کیف و نشاط کے لئے آراستہ ہیں۔ وہ جماعتیں جو ہر

منزل پر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ساتھ رہتی ہیں اور پھر وہ جماعتیں جن کی نگاہ ماضی اور حال اور مستقبل کو ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی تاریخ کا مطالعہ کرتی ہوئی، انسانوں میں ایک نئی تمدنی، سیاسی، اور معاشی اشتراک کی داغ بیل ڈال رہی ہیں۔ ہمارے ادب میں یہ تمام جماعتیں مصروف کار نظر آتی ہیں اور ادیبوں کے مختلف گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جماعتوں میں سے کسی نہ کسی ایک جماعت سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ موخر الذکر جماعت ترقی پسند ادیبوں کی ہے اور ہم لوگ اس لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں کہ اپنے گردو پیش کے حالات پر نظر ڈالیں اور اس کی روشنی میں اپنے لئے ایک صحیح لائحہ عمل مرتب کریں۔

پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نتائج میں جو نمایاں فرق مجھے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہم اپنے جمہوری مقاصد کے زیادہ قریب آگئے ہیں۔ پورے ایشیا میں آزادی کی روح غزلخواں نظر آتی ہے۔

ایشیائی روس کے ادیبوں کے افکار میں اس بادۂ آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے جب قوم آزاد ہو جاتی ہے۔ جب اس کے تہذیبی افق پر سے غلامی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ جب اس کا مذہب غیروں کی ریشہ دوانیوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور جب اس کا سماج باہمی اشتراک کے اصولوں پر کاربند ہو کر ایک غیور خودی سے سرشار ایک بلند و بالا مستقبل کی طرف بے جھجکے بڑھتا ہے۔ سوویت ایشیا کے ادیبوں کے نغمے، پہاڑی چڑیوں کے چہچہے میں وہ اپنے مستقبل کو ایسی طمانیت سے دیکھتے ہیں، جو ابھی ہماری نگاہوں کو

میسر نہیں۔ ہمیں بھی اپنے سوئے ہوئے مرغزاروں کو جگاتا ہے۔ اس کی خواب ناک وادیوں کو گونجاتا ہے اپنے خزاں رسیدہ چمن میں اس بہار کو تازہ کرتا ہے جس کی کلیاں ہمارے دلوں میں پھوٹ رہی ہیں اور جس کا سنگیت ہماری روحوں میں نغمہ ریز ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا پورے ایشیا میں آزادی کی لہر جاری و ساری ہے۔ ایشیا ہی نہیں افریقہ میں بھی، عربستان اور ایشیائے کوچک کا علاقہ اور خطہ بحر روم کے عرب علاقہ اور شام و لبنان میں یہ تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ وہاں کے نئے ادیبوں کے افکار میں اور صحافیوں کی تحریروں میں یہی رنگ غالب ہے۔ یہی آواز ہر جگہ سے بلند ہو رہی ہے۔ نعرۂ آزادی، حق خود ارادیت اور مغربی استعماریت سے نجات اور رد دیوار رنگ و نسل و خون کے خلاف ایک شدید احتجاج جو مغربی افریقہ کے نیگرو ادیب ہیں ان کی تحریروں میں بھی آپ کو آزادی سے متعلق اسی تجسس اور بیقراری کا پتہ چلتا ہے۔ زنجیروں کو توڑ دینے کی آرزو ہے۔ خود نئے ایرانی ادیبوں خصوصاً آذربائیجان کے علاقے کے ادیبوں میں جو اشتراکی فلسفہ سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں ساقی و مینا و جام کا بہت کم ذکر ہے۔ اس لئے کہ جب ساقی قحط سے مر جائے اور شراب میں زہر ملا دیا جائے اور جام ہاتھ سے چھن جائے تو نغمے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے بہار پھر آ جائے، شہد آگیں ہونٹ پھر مسکرانے لگیں اور آنکھوں میں ہنسی کے کنول کھلنے لگیں۔ لیکن جب ادیب دیکھتا ہے کہ یہ بہار ساختی ادب میں ممکن نہیں تو وہ اشتراکی ادب کی تخلیق پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نظام زندگی کی تخلیق پر جہاں ٹریکٹروں کی کاوش سے زمین ہُن اگلتی ہے اور فارم اور

کارخانے مزدوروں اور کسانوں کے باہمی اشتراک سے چلتے ہیں اور ملک کا ہر فرد اپنے مستقبل اپنے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتا ہے۔

پہلی جنگ میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ کم از کم اس حد تک جنتا کی لڑائی آگے نہیں بڑھی تھی۔ اس وقت مختلف استعماری قوتوں کی ٹکر تھی۔ ایسی قوتیں جن میں سے چند ایک مخالف جماعتوں کے مقابلہ پر زیادہ ترقی پسند جمہوری اداروں کی حامل تھیں۔ پھر بھی گزشتہ جنگ نے انقلاب روس کو جنم دیا اور اشتراکی فلسفہ کو فلسفے کی حدود سے نکال کر عمل کا جامہ پہنایا اور ادھر استعماری علاقوں میں انقلابی قوتوں کو مضبوط کیا اور نو آبادیات کے باشندوں میں آزادی سے اور اس سے متعلق خیالات کی ترویج کی۔ لیکن اس جنگ میں جنتا کی لڑائی اور آگے بڑھی ہے۔ اب کی مقابلہ صرف استعماری قوتوں میں نہ تھا، اب کی مقابلہ اشتراکیت اور فاشسیت میں تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کی نیم استعماری، نیم جمہوری حکومتوں نے بھی حق ارادیت اور ''چار آزادیوں'' یعنی ''فور فریڈمس'' کے نام پر یہ لڑائی لڑی ہے۔ اور اپنے ملکی عوام کے سامنے بار بار انہیں خیالات کی اشاعت کی۔ تاریخ نے انھیں مجبور کر دیا کہ فاشسیت کے مقابلہ اشتراکیت کا ساتھ دیں اور اس طرح سے خود ہی استعماریت اپنے ہاتھوں استعماریت کے ہاتھ کمزور کرے۔ چنانچہ اس جنگ میں جہاں فاشسیت کو مکمل شکست ہوئی ہے وہاں استعماریت کی مستحکم دیواریں بھی ہل گئی ہیں۔ ہندوستان سے لے کر ملیشیا تک اور آزادی کے جذبے کی پشت پناہی کے لئے دنیا بھر کی ترقی پسند جماعتوں کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس میں دیوار رنگ و نسل کی تفریق بھی نہیں ہے۔ اگر انڈو چائنا میں

حریت کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو فرانس کی تحریک مقاومت اور وہاں کے ادیب اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگر جاوا میں ایشیائی آزادی چاہتے ہیں تو آسٹریلیا کے ہزاروں گورے مزدوران اسلحہ جات کو جہازوں میں بھرنے کے لئے انکار کر دیتے ہیں۔ جو غیر ترقی پسند جماعتوں کی طرف سے اس تحریک کو کچلنے کے لئے جاوا میں بھیجے جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایشیا میں اور امریکہ میں جنتا کی اس لڑائی کو اور بھی تقویت پہنچانی چاہئے۔ اور اس Resistance Movement کا جو مراکش سے لے کر ہند چین تک ایک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے، خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اسے اپنی تحریروں میں ایک نمایاں جگہ دینا چاہئے۔ پہلے اگر انگریزی سامراج محبان وطن کو پھانسی کے تختوں پر لٹکا کر نہتوں پر گولیاں چلا کر اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش کرتا تھا تو آج ہندستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور نفع خوروں کے دو متضاد گروہوں کی آڑ لے کر اور اپنے مکروہ چہرے پر نقاب ڈال کر وہ ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکاتا ہے۔ تاکہ انقلابی عوام متحد ہو کر اس سے لڑنے کی بجائے آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اور اس طرح سامراجی طاقت اور ہندستانی رجعت پسند مفاد فنا ہونے سے بچ جائیں۔

سیاسی محاذ پر اگر خانہ جنگی کے حربے سے انگریز کھلی شکست دینا چاہتے ہیں تو تہذیبی اور ادبی محاذ بھی ان کے اور ان کے ساتھ مل جانے والے ہندو اور مسلمان فرقہ پرست امیروں کے خطرناک حملوں سے محفوظ نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کی تحریک کے لئے سب

سے زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ پڑھے لکھے درمیانہ طبقہ میں فرقہ پرستی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے اور بہت سے وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو آزادی خواہ سمجھتے ہیں، انگریزوں سے پہلے اپنے ہم وطنوں سے لڑنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ سیاسی حقیقت بینی کے فقدان کے ساتھ ساتھ معمولی انسانیت اور معمولی شرافت تک کو بھلا دینا ان لوگوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں جہاں انسانیت کی بنیادی قدروں اور ابتدائی مفروضات کو پیروں سے کچلا جائے۔ ترقی پسند ادیبوں کا کام بہت دشوار ہو جائے گا اور انہیں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن سستی مقبولیت کے لئے ہم نے کبھی اپنے اصولوں کو ترک نہیں کیا۔ آج تو اس کی اور ضرورت ہے کہ مسلمان اور ہندو فرقہ پرستی کے اس طوفان میں ہم انسانیت کے اس ہمہ گیر نصب العین کو جو مذہب اور فرقوں کی تفریق کو بے کار اور نقصان دہ سمجھ کر عالمگیر انسانیت کی برادری اور مساوات پر قوم کی آزادی اور اشتراکیت کے اصولوں کو اپناتا ہے جو ملک کی خانہ جنگی کو انگریزی سامراجیوں اور ہندوستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک نحس سازش تصور کرتا ہے اور ہر مذہب وملت اور فرقہ کے محنت کش عوام اور درمیانی طبقہ کے باہمی انقلابی اتحاد کو ہندوستان کی انقلابی جدوجہد کی کامیابی اور مستقبل کی معاشرت کی کنجی سمجھتا ہے۔ اپنی ادبی تخلیقوں میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف پہلوؤں کو پیش کریں۔ میری رائے میں اس وقت ہندوستانی ادیبوں سے ترقی پسندی کا یہی سب سے اہم تقاضہ ہے۔" [۴۹]

یہ خطبۂ صدارت کرشن چندر کے رپورتاژ "پودے" سے ماخوذ ہے۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ اپریل ۱۹۶۳ء میں جالندھر سے شائع ہوا ہے۔ جس کے ناشر چرنجیت لال ہیں۔ اس کی کتابت نہایت بوسیدہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خطبۂ صدارت کے خاتمہ پر سجاد ظہیر کا نام لکھا ہے۔ جبکہ اس کے ٹھیک آگے پیش لفظ میں کرشن چندر کا نام درج ہے۔

حقیقتاً یہ صدارتی خطبہ کرشن چندر کا ہے۔ کیونکہ سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ہے کہ اس کانفرنس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ خود کرشن چندر نے 'پودے' میں ہی لکھا ہے کہ انھوں نے جو مقالہ (خطبہ) پیش کیا اس میں مراکش سے لے کر جاوا تک کے آزادی پسندوں کا ذکر ہے۔[۳۰]

maablib.org

بھوپال کل ہند کانفرنس

(علاقائی انجمن بھوپال کی طرف سے)

۲۵رجنوری تا ۲۹رجنوری ۱۹۳۹

بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۲۵رجنوری سے ۲۹رجنوری ۱۹۳۹ء تک بھوپال ہی میں ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی۔ کسی شہری انجمن نے پہلی بار کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ اس کی صدارت مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے کیا تھا۔ جب کہ اس کا افتتاح مذہب اسلام کے مشہور عالم، دانشور اور ادیب مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا اور افتتاحی خطبہ بھی پیش کیا۔ مولانا نے اپنے خطبہ میں ترقی پسند تحریک کے اغراض ومقاصد کو سراہا، اس کی خوبیاں بیان کیں اور خامیاں جو کہ ترقی پسندوں میں یقیناً تھیں اور ہیں، ان کی نشاندہی کی اور خبردار کیا۔ مولانا کا یہ افتتاحی خطبہ درج ذیل ہے جو کہ ترقی پسند تحریک کے لئے اہم دستاویز ہے۔

سید سلیمان ندوی کا افتتاحی خطبہ

نوجوان ادیبو! اور ہندستان کی زبان اور قلم کے مالکو!!

خوشی کی بات ہے کہ آج ایسے موقع پر جب لوگ سیاسی اور راج نیتک جھگڑوں میں پھنسے ہیں، چند ایسے لوگ بھی ہیں جو ان سے اونچی باتوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے بھوپال کے ترقی پسند اہل قلم کے بلاوے پر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند اہل قلم کیا کہتے ہیں اور کیا بلاوا دیتے ہیں اور ان کے دل میں کیا ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں، اس کے متعلق کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں میں نے سنی ہیں۔ لیکن خود میری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں ان میں شریک ہو رہا ہوں۔

زبان اور قلم کی قوت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ جس کو ملی ہے حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس وقت کو وہ ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوق الٰہی کو فائدہ پہنچے۔ جن سے سچائی ابھرے اور جھوٹ نیچے ہو، جن سے نیکی پروان چڑھے اور بدی پست ہو۔ جن سے اچھائی پھیلے اور برائی دبے، جن سے دیس والوں میں بلکہ دنیا کے بسنے والوں میں میل ملاپ ہو، انسانی بھائی چارہ اور امن اور شانتی پیدا ہو۔ لڑائی کا چرچا بند کیا جائے۔ لوگوں کے دلوں سے انسانوں سے نفرت کرنے کا جذبہ مٹے اور اس کی جگہ برائی سے نفرت اور بروں سے ہمدردی کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی یہی ہے کہ ان کو برائی بتائی اور سمجھائی جائے اور جس طرح بیماروں کو نہیں

بلکہ بیماری کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کی خدمت اور تیمارداری کرتے ہیں۔ راہ سے بھٹکے ہوؤں اور راہ میں دھوکہ دینے والوں کی خدمت کر کے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر کے ان کو سیدھی راہ سمجھائیں۔

ساری دنیا لڑائی کے زخموں سے چور ہو گئی ہے۔ قوم کی قوم پر چڑھائی، دیس کی دیس سے دشمنی اور نسل کی نسل سے نفرت نے انسانیت کے جسم کو لہولہان کر دیا ہے۔ پچھلی دو لڑائیوں میں جو کچھ ہوا اس کو کون نہیں جانتا۔ خود اس ملک میں بسنے والوں نے انسان ہو کر جانوروں سے بھی بڑھ کر جو کام کیے وہ ہندستان کی عزت کی آنکھ جھکانے کے لئے کافی ہیں۔ آج بھی انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ انسانیت کے لئے شرم ہے۔ امپیریلزم یا سامراجی اور شہنشاہی کا دور کہتے ہیں کہ ختم ہو گیا لیکن ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صورت بدل گئی ہے، سیرت وہی ہے اور سرمایہ داری اور مزدوری کے جھگڑے اسی کی دوسری شکل ہیں۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی زبان اور قلم کو آگ بھڑکانے میں نہیں، بلکہ اس کے بجھانے کے کام میں لائیں۔ آپ اپنے میٹھے بول اور سریلے گیتوں سے غم سے بھرے ہوئے دلوں کو تسکین کا پیغام دیجئے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیے اور محبت کی گھلاوٹ سے نفرت کی تلخی کو دور کیجئے۔ چین اور برما میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس سے ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔

میں نے ترقی پسند ادیبوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب ہماری زندگی کا ساتھ دے۔ یہ بات بالکل ٹھیک

ہے۔ جن لوگوں کی نظر مختلف ملکوں کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہر قوم کے ہر زمانے کا ادب اس کی زندگی کی تصویر ہوتی ہے بلکہ قوم اور اس کے زمانہ کے ادب کو پڑھ کر بالکل ممکن ہے کہ ہم اس قوم کی دماغی، ذہنی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کا پتہ پا لیں۔ کیا شاہنامہ اور فرخی، عنصری وغیرہ کے دیوان نہیں بتاتے کہ سلطان محمود کے عہد میں اس کی مملکت کی کیا فضا تھی اور کیسی عسکریت چھائی ہوئی تھی۔ کیا اندر سبھا، فسانہ عجائب، طلسم ہوشربا، قصہ چہار درویش، آرائش محفل، دیوان رنگین، دیوان جان صاحب نہیں بتاتے کہ اس عہد کے لوگ کس تمدن کے رنگ و بو اور خیالات واوہام میں پرورش پا رہے تھے، پھر کیا حالی، اکبر، اسماعیل میرٹھی اور شبلی کے کلام اصلاح وتجدید اور احساس کا پیغام نہیں اور کیا اقبال کا کلام نئی تعلیم اور نئے خیالات کا پیامبر نہیں۔ زمانہ بظاہر بے زبان ہے مگر حقیقت میں بے زبان نہیں۔ اس کے زمانے کا شاعر، ادیب اور مصنف اس کی زبان ہے اور اسی زبان سے وہ اپنا حال دنیا والوں کو سناتا ہے۔ اس لئے آج کا نوجوان ادیب جب اپنے زمانہ کے خیالات کی ترجمانی کرنا چاہیں تو یہ دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہیں۔ یوں ہی ہوا ہے اور یوں ہی ہوتا آیا ہے۔ اور یوں ہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے نوجوان ادیب میری آج کی شکل وصورت دیکھ کر اور خیالات کو سن کر دل میں یہ کہتے ہوں گے ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، کبھی میں بھی جوان تھا اور کبھی میں

بھی نوجوان ادیب تھا۔ اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اسی قسم کے اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے۔ آخر میں بھی پرانا ہوا، اور ان کی عمر کو پہنچا تو مجھے بھی اپنے نوجوان کے نئے تیور دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے۔ غالب کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ غالب نے اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا تمہاری گوری رنگت دیکھ کر مجھے رشک نہیں آیا کیونکہ جب میں بھی جوان تھا تو میرا رنگ بھی چمپئی تھا، تو نوجوانو!

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری سنو جو گوش حقیقت نوِیش ہے

میری قلمی خدمت کی نصف صدی گزر چکی ہے۔ ۱۹۰۱ء کے مخزن سے میری قلمی خدمت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ مخزن نئے ادیبوں اور نئے شاعروں کے جذبات اور ولولوں کو لے کر نکلا تھا۔ لیکن آج وہ سارے ادیب و شاعر پرانے ہو چکے اور اب نئے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی دنیا ہے۔ لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا اور تمہارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہو چکا ہوگا۔ اس لئے نیا اور پرانا ہونا تو کوئی خاص بڑائی کی بات نہیں۔ نہ ہی پرانی چیز غلط ہے اور نہ ہی نئی چیز ٹھیک ہے۔ اس غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے۔ مولانا روم اور سعدی و حافظ کا کلام اب بھی زندہ ہے۔ مہابھارت اور رامائن پرانے نہ ہوں گے۔ گیتا آج بھی زندہ ہے اور قوموں کو زندگی دے رہا ہے۔

ہر قوم کا اعلیٰ ادب وہی ہے جس نے اسے زندگی بخشی ہے اور اب بھی وہی ہوگا جو اس کو زندگی بخشے گا۔ سندھی کی کافی، پنجابی کی گرنتھ صاحب، ہندی میں گیتا اور کبیر کا کلام، بنگالی میں ٹیگور اور اردو

میں اقبال ادب کے وہ نمونے ہیں جنھوں نے نئے خیالات بخشے اور نئی زندگی پیدا کی۔

حضرات! اس نئی ترقی پسند تحریک کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سوشلزم اور کمیونزم پر ہے اور ترقی پسند نوجوانوں کے متعلق لوگوں میں اور بھی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان بدگمانیوں کی وجہ ان میں سے بعض کی زبان اور ادب کے اصول اور قواعد سے بے پروائی اور خیال وشعور میں بے اعتدالی اور اس کے اظہار خیال میں فکر پسندانہ پیدا کی ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب ترقی پسند نوجوان اپنی غلطی کو محسوس کرنے لگا ہے۔ اور اب اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔ نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں شروع شروع یہی حال ہوتا ہے۔ وہ غلطیاں کرتا ہے اور ان غلطیوں کے کرنے میں بے باک ہوتا ہے اور جدت کے شوق میں اپنے لئے نئی راہیں نکالنا چاہتا ہے۔ لیکن تجربے کے بعد ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتا ہے اور اپنی غلطی محسوس کرتا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شروع میں وہ یہاں تک اعتدال سے باہر تھا کہ فن سے بھی آزاد، اصولوں سے بھی آزاد اور محاوروں سے بھی آزاد تھا۔ لیکن اب اسکی آزادی ایک ایک کر کے دور ہوتی جارہی ہے۔ پچھلے چند سالوں کی اس تحریک پر نظر ڈالئے تو میرے اس بیان کی تصدیق ہوگی۔ یہاں پر ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک شاعر اور مقرر میں بڑا فرق ہے۔ شاعر اپنی کہتا ہے اور خطیب دوسروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاعر اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے وہ اپنے آپ میں مست ہوتا ہے اور اس کو دوسروں کی خبر نہیں ہوتی۔ خطیب اور مقرر دونوں

کے خیالات اور دوسروں کے جذبات ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔
اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو خیالات حافظ کے ہیں اور جن کو انھوں نے اپنے اشعار میں بار بار ظاہر کیا ہے وہ چند سے زیادہ نہیں۔ حافظ نے انہیں بار بار دہرایا ہے۔ خیام کی رباعیاں پڑھئے وہی چند خیالات خیام کے پاس ہیں جن کو وہ الٹ پلٹ کے کہتا ہے۔ صرف طرز ادا میں فرق ہے، معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہی حالات موجودہ بڑے شاعروں کے ہیں۔ ٹیگور کو دیکھئے وہی چند خیالات ہیں، وہی چند باتیں ہیں، اقبال کو اٹھا لیجئے وہی چند باتیں ملیں گی۔ یہ ان شعرا کا حال ہوتا ہے جو صاحب پیام ہوتے ہیں۔ جن کو وہ عمر بھر دہراتے رہتے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور جن کے ماننے پر ان کے نزدیک دنیا کی اصلاح وفلاح موقوف ہوتی ہے۔

حضرات! یقین دلیلوں سے نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بیان اور صاحب بیان کی سچائی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہماری شاعری تکلفات سے سادہ اور مبالغوں سے خالی ہو اور جو بیان کیا جائے وہ شاعر کے دل کی بات ہو۔ وہ صرف محفل کی گرمی اور داد طلبی کے لئے نہ ہو۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن مجھے اپنا ایک شعر یاد آگیا۔

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کسی دعوائے باطل میں

آپ میں سے جن لوگوں کو گاندھی جی کی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو وہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی اچھے مقرر نہیں تھے۔ گاندھی

جی کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ ان کے ہندستانی کے لفظ بھی ٹھیک نہیں ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی ہندستانیوں نے ان کے قلم اور زبان سے کتنا فائدہ اٹھایا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جو کام گاندھی جی نے اس ملک میں کیا وہ کسی ملک میں انجام نہیں دیا گیا۔ دنیا کے دوسرے حصوں کو دیکھئے کیا ہورہا ہے۔ چین کی خانہ جنگی نے اس کا کیا حال بنا دیا ہے۔ برما میں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ انڈونیشیا میں سیاسی مکاری اور چالبازی کا مظاہرہ ہورہا ہے۔ لیکن گاندھی جی نے ہندوستان میں جس خیال کو پیش کیا تھا وہ سادہ عملی فلسفہ تھا۔ وہ محض جذبات نہ تھے۔ ان کا یہ فلسفہ اصول پر مبنی ہے۔ ان کا یہی فلسفہ ہے جس نے ہندستان کو آزاد کرایا۔ جس کے ذریعہ وہ ملک میں امن وامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔۔ اگر ملک کے تمام فرقے سچائی کے ساتھ ان پر عمل کرتے اور اس میں نفاق نہ برتتے تو اتنا بھی نہ ہوتا جتنا ہندوستان میں ہوا۔ جس پر سب کو افسوس ہے۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ ملک کی خاطر کام کریں اور باہمی اتحاد کا پیام عام کریں وہ طبقات کی نفرت کے بجائے لوگوں کو محبت کا پیام سنائیں۔ ان کی شاعری صرف واہ واہ اور ہر قدیم کی بیخ کنی اور ہر پرانی بات کی توہین نہ ہو۔ غرض یہ کہ ان کی شاعری کا مقصد تعمیر ہو، تخریب نہ ہو۔ نئی شاعری کے نئے انداز اور نئی پرواز اور نئے تقاضوں سے ہم کو انکار نہیں۔ نہ ہم کو سرمایہ داری کی مذمت، کسانوں اور مزدوروں کی مظلومی کی داستان سے انکار ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ دہقان کے پسینے کی بربادی اور غریبوں کی

تباہی پر ہمدردی ہو۔ صرف محفل کی گرمی کے لئے مزدور، کھیت، کسان، دہقان اور جھونپڑی کا تذکرہ نہ ہو۔ ورنہ یہی کہا جائے گا کہ جس طرح اگلے شعراء گل و بلبل سے اپنا مطلب ادا کرتے تھے اسی طرح آج دہقان، کھیت اور مزدور سے مقصد کو ادا کیا جا رہا ہے۔ حقیقت نہ وہاں تھی نہ یہاں۔

حضرات! یہی چند باتیں تھیں جن کو اختصار کے ساتھ مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ابھی ہم نے اپنے نئے ادب کی تعمیر کے لئے جو ملت کی بھی تعمیر کا سبب ہے، بہت کام کرنا ہے۔ تو جوانو! قدم آگے بڑھاؤ، زمانے کی قوت تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ بایں ہمہ اپنے وقت کے بوڑھوں کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ بوڑھے حافظ کا مشورہ ہے۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

ان مختصر لفظوں پر میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

maablib.org

پانچویں کل ہند کانفرنس، بھیمڑی

۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۳۹ء

جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تھی تب ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا اور تمام ہندوستانی اس طوقِ غلامی سے آزادی چاہتے تھے۔ بلا تفریق مذہب و ملت اور فکر و نظر سب کی کم از کم یہی خواہش تھی کہ اس باہری تسلط اور محکومی سے نجات ملے اور ہم خود اپنی سلطنت سنبھالیں اور حکومت کریں جس سے ہماری قوم خوشحال اور کامیاب ہو سکے۔ اس وقت ہمارا دشمن انگریز تھا اور اس کے ظلم و جور والے وہ قوانین جو حق گوئی، بیباکی اور انسانی حریت پسندی کو سلب کرتے تھے یا پھر ملک کے وہ چند لوگ جو دولت و اقتدار کے نشے میں ہندوستانی عوام، کسان و مزدور پر مظالم کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپسی اختلافات، تہذیبی تصادمات اور کچھ بغض و عناد بھی تھے مگر یہ سب خواہش آزادی کے سامنے ماند پڑے ہوئے تھے یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہمیں آزادی حاصل ہو گئی اور خاص و عام کا یہ بنیادی مقصد پورا ہو گیا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور حکومت ہندوستانیوں کو سونپ گئے تو اب ان ثانوی اور جزوی

اختلافات کو بھی سر اٹھانے کا موقع مل گیا جو ابھی تک پس پشت پڑے ہوئے تھے۔ پھر جو آزادی ہمیں ملی تھی اس نے ہم سے بہت بڑی قیمت وصول کی تھی جو ہمیں فسادات کی شکل میں چکانی پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب قوم ہندوستانی نہ رہکر ہندو اور مسلمان بن چکی تھی۔ پاکستان بننے کی وجہ سے اردو زبان پر بھی آنچ آئی اور اب وہ صرف مسلمانوں کی زبان تسلیم کرکے پاکستانیوں کے حوالے کر دی گئی۔ وہ ہندوستان جو انگریزوں کے ظلم کا شکار تھا اب خود اپنے ہی لوگوں کے ظلم کا شکار ہونے لگا۔ ادب بھی اس سے اچھوتا نہ رہ سکا کیونکہ ادیب اسی سماج کا ہی فرد تھا۔

کمیونسٹ پارٹی، ہندوستان کی آزادی کو" آزادی" تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ کمیونسٹ اسے جھوٹی آزادی کہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سوویت روس کی طرز پر یہاں بھی انقلاب کی ضرورت ہے جو کہ نہ صرف حکومتی سطح پر بلکہ سماجی اور معاشی سطح پر بھی کارفرما ہو۔ کمیونسٹوں کے نزدیک یہ قطعی درست نہیں تھا کہ ہندوستان دولت مشترکہ Common Wealth کا ممبر بنے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس عوام دوست نہیں ہے بلکہ وہ بورژوا طبقہ، سرمایہ دار اور مل مالکوں کی غلام ہے۔ حکومت اور اقتدار میں آکر وہ بھی ظلم کر رہی ہے۔ امیری غریبی کی خلیج آج بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی پہلے تھی تو ہمیں ایسی آزادی سے کیا حاصل۔ فیض احمد فیض نے صبح آزادی کے عنوان سے جو نظم لکھی اس میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

....

....

کدھر سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

غرض کہ موجودہ کانگریسی حکومت اور کمیونسٹ پارٹی میں نظریاتی اختلافات وسیع ہوتے جارہے تھے وقتاً فوقتاً حکومت نے بھی قانون کا سہارا لے کر ان کو جیلوں میں ٹھونس دیا اور ان کے پاسپورٹ ضبط کر لئے۔ اپریل مئی ۱۹۴۹ء میں رسالہ "ہنس" پر پابندی عائد کر دی گئی اور سردار جعفری کو ناسک جیل میں قید کر دیا گیا۔ ۳۱

اسی درمیان کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں بھی تبدیلی آئی۔ پورن چند جوشی کی جگہ بی۔ٹی۔ رندیوے کمیونسٹ پارٹی کے نئے جنرل سکریٹری بنے۔ نظریاتی معاملے میں رندیوے سخت واقع ہوئے۔ چونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں کمیونسٹ خیال سے متاثر یا بیعت ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی اچھی خاصی تعداد تھی اس لئے رندیوے نے اس انجمن میں سیدھے دخل دینے کی کوشش کی اور وقتی طور پر کامیاب بھی ہوئے۔ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس اس کی مثال ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۲۷،۲۸،۲۹ رمئی ۱۹۴۹ء کو ایک کل ہند کانفرنس بلائی، جسے بمبئی میں اجازت نہ ملنے کے سبب بھیمڑی میں منعقد کیا گیا۔ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض اس وقت پاکستان میں تھے اور سردار جعفری جو کہ عارضی جنرل سکریٹری تھے ان دنوں ناسک جیل میں بند تھے۔ ایسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باگ ڈور کیفی اعظمی نے سنبھال رکھی تھی۔ کیفی اعظمی اور ان کے رفقاء نے جب بمبئی میں کانفرنس کرنی چاہی تو صوبہ کے موجودہ کانگریسی وزیر اعلیٰ مورارجی دیسائی نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے یہ

کانفرنس بمبئی کے مضافاتی علاقہ بھیونڈی میں ہوئی جس کے لئے بھیونڈی کے مقامی باشندے ''ملک تاسے'' کی معاونت بھرپور رہی۔ ملک تاسے اپنی یادداشت پر مبنی ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

''پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کی ایما پر کیفی میرے پاس آئے اور انھوں نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت کے صوبہ بمبئی کے وزیر اعلیٰ مورار جی دیسائی نے مجوزہ کل ہند کانفرنس کے بمبئی میں انعقاد کی اجازت کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا اور کیفی بمبئی سے باہر اس کے لئے کسی مناسب جگہ کے متلاشی تھے وہ چاہتے تھے کہ میں مناسب جگہ ڈھونڈنے میں ان کی مدد کروں۔ غور کرنے پر مجھے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کا ٹمک سار یاد آیا جو بمبئی سے کوئی پچاس میل دور بسین نامی ایک ریلوے اسٹیشن کے مقابل واقع تھا۔ میں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ان صاحب کی رضامندی معلوم کر کے آپ سے رجوع کروں گا۔ ان صاحب کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ہم بذریعہ ٹرین بسین کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمراہ شوکت اعظمی صاحبہ بھی تھیں۔ دوپہر کا لنچ میزبان کے گھر پر کرنے کے بعد ہم نے جگہ کے محل و وقوع کا جائزہ لیا۔ جگہ کچھ ناکافی سی لگی اس پر میں نے کیفی کو رائے دی کہ میرے ساتھ چل کر بھیونڈی کے سردار رئیس ہائی اسکول کا جائزہ لیں۔ کیفی تیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک روز میرے ہمراہ بھیونڈی پہنچے۔ رات بھر میرے غریب خانہ پر قیام رہا اگلی صبح ہم نے اسکول کا رخ کیا اسکول میں ان دنوں تعطیل تھی۔ اسکول کی عمارت، ہاسٹل اور وسیع میدان غرض کہ

پورا احاطہ کل ہند کانفرنس کے کے لئے کافی مناسب و موزوں نظر آیا۔ جگہ کے انتخاب کے بعد کیفی بمبئی روانہ ہو گئے اور میں ضروری معاملات طے کرنے کی غرض سے رک گیا۔ اس وقت اسکول کی مجلس عاملہ کے صدر کانگریسی رہنما مصطفیٰ فقیہ صاحب تھے جو بعد میں حکومت مہاراشٹر میں وزارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ میں مجلس عاملہ کا رکن تھا اور ان کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے انعقاد کے لئے حامی بھر دی۔" ۳۲

اتفاق دیکھئے کہ جو کانگریس، تحریک کی مخالف تھی اور جس کے صوبائی سربراہ نے کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہیں دی تھی، بھیونڈی کانفرنس اسی کانگریس کے ایک رہنما کے اسکول میں منعقد ہو گئی۔ بہر حال سردار رئیس ہائی اسکول میں یہ سہ روزہ کانفرنس ہوئی اور اس میں اردو کے علاوہ دیگر مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیب و شاعر و فنکار شریک ہوئے۔ قابلِ ذکر شرکا میں ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر عبد العلیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما، اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، صفیہ اختر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، مجروح سلطانپوری، ہنس راج رہبر، حبیب تنویر، کیفی اعظمی، شاہد لطیف، وشوا متر عادل، نیاز حیدر اور سعید اختر وغیرہ موجود تھے۔

کانفرنس کا آغاز ملک تاسے کے استقبالیہ خطبے سے ہوا جو کہ انتظامیہ کمیٹی کے ایک اہم رکن تھے۔ کانفرنس میں شرکت کرنے آئے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

"آپ ہمارے لئے (بھیونڈی والوں کے لئے) نئے نہیں ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے آپ یہاں پہنچ چکے تھے۔ کرشن چندر کی 'پشاور ایکسپریس' فضا میں خون کی بوندیں اچھالتی ادھر سے گزری ہے۔ بیدی کے 'گرہن' کو ہماری نگاہیں بھی دیکھ چکی ہیں،

عصمت اپنے تیز ناخنوں سے سماج کی فرسودہ دیواروں کو کریدتی
ہوئی ہمارے گھروں میں داخل ہو چکی ہیں اور مجاز کا دیوانہ یہ کہتا ہوا
'میں جاؤں گا، میں جاؤں، میں جاتا ہوں، میں جاتا ہوں' کسی اور
دیار کو چلا گیا۔'' ۳۳

اس رسمی استقبالیہ خطبے کے بعد افتتاحی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ عصمت چغتائی نے ادیبوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ثقافتی اور ادبی تنظیموں پر ہونے والے حملوں کا ہمیں منہ توڑ جواب دینا ہوگا۔ راجندر سنگھ بیدی نے ''پاکستانی انجمن ترقی پسند مصنفین'' کا تحریری پیغام پڑھ کر سنایا۔ اس کے علاوہ پال رابنسن، جولیو کیوری، لوئی آراگوں وغیرہ کے بھی پیغامات آئے تھے جو کہ پڑھ کر سنائے گئے۔ [۱۹] اس کے بعد ہندی ادب پر رام بلاس شرما نے ایک رپورٹ پیش کی۔

دوسرے دن کے اجلاس میں آزادی کے مسئلہ پر کانگریسی حکومت کے عوام مخالف رویہ پر اور سرمایہ داروں اور اقتدار پسندوں کے ظلم وستم پر زوردار بحث ہوئی۔ اس کے بعد عالمی امن کے مسئلے پر ملک راج آنند نے ایک قرارداد پیش کی، اور ایک قرارداد ہندستان کے دولت مشترکہ Common Wealth میں شامل ہونے کے خلاف بھی منظور کی گئی۔ دوسرے دن کے آخری اجلاس میں جو کام سب سے اہم اور متنازع ہوا وہ تھا انجمن کا منشور جسے ڈاکٹر رام بلاس شرما نے پیش کیا اور کرشن چندر نے اس کی تائید کی۔ اس منشور کو ڈاکٹر عبدالعلیم کی تائید حاصل تھی یا نہیں یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ:

''تعجب یہ ہے کہ ایسے ہی میں بھیمڑی کانفرنس بھی ہوئی
جس میں ڈاکٹر علیم کا انتہا پسندانہ مضمون بلکہ منشور منظور بھی ہو گیا اور
اسی زمانے میں ساغر نظامی کے خلاف انتہا پسندانہ کارروائی بھی
ہوئی، خواجہ احمد عباس کے خلاف رد وکد بلکہ سب وشتم کا مظاہرہ بھی
ہوا۔ معین احسن جذبی کے خلاف علی گڈھ کی ترقی پسند مصنفین کی

انجمن نے مرتب تادیبی ریزولیشن بھی منظور کیا۔'' ۴۳؎

بھیونڈی کے اس انتہا پسندانہ منشور کے لئے یہاں پر ڈاکٹر عبدالعلیم کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے جبکہ عابد سہیل صاحب کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر علیم نے اس منشور کی مخالفت کی تھی۔ اس کے ثبوت میں وہ سید محمد مہدی کا لکھا ہوا خط پیش کرتے ہیں جو کہ اس کانفرنس میں موجود تھے :

''رندیوے نے اس لائن کو پیش کرنے کے لئے مقرر کیا تھا ڈاکٹر رام بلاس شرما کو جو آگرے کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ غرض یہ لائن موصوف نے بہت زور شور سے پیش کیا وہاں سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند بھی اور ڈاکٹر علیم بھی۔ عصمت چغتائی بھی اور کرشن چندر بھی۔ ڈاکٹر علیم نے اس لائن کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے اپنے خاص انداز میں جس میں طنز کی چاشنی ہوتی تھی سمجھانے کی کوشش کی۔ بھئی یہ ادیبوں کی انجمن ہے، کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے۔ ادب حکم دے کر نہیں لکھوایا جاتا۔ جن کو آپ بورژوا ادیب کہہ رہے ہیں انھوں نے دنیا کے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ان سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے مگر اس گرما گرم ماحول میں یہ باتیں اصلاح پسند تصور کی گئیں اور رام بلاس شرما کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی ڈاکٹر علیم پر خوب حملے کئے۔''

(سید محمد مہدی کا خط عابد سہیل کے نام)

بہر حال حقیقت جو بھی ہو مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ ملک میں نظریاتی اختلافات اور فکری تضادات ابھر کر سامنے آچکے تھے اس لئے اب کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ادیب، شاعر و فنکار انجمن کو سیدھے پارٹی سے جوڑنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر کھلی بحث ہوئی اور آخر کار اس منشور کو منظور کرلیا گیا۔ ابھی تک انجمن اشتراکیت کو تسلیم تو کرتی تھی

مگر اس کے ممبران اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں تھے۔ اسی لئے یہاں جو منشور منظور کیا گیا وہ سبھی کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ انجمن سے منسلک ادیب و شاعر انسانی مساوات اور ہمدردی کے قائل ضرور تھے، سرمایہ داری اور ظلم و جور کے مخالف تھے مگر سب کا سیاسی مسلک ایک نہ تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کانگریس کے ہمنوا تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کسی پارٹی کا لیبل لگانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن یہاں جو منشور پیش ہوا اور منظور کیا گیا اس نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو پارٹی کا ایک آلۂ کار بنا دیا نیز ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے تقاضہ کیا کہ وہ اسی منشور کے تحت تخلیقی عمل کو بروئے کار لائیں۔ اس نئے منشور نے غیر کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو الجھن میں مبتلا کر دیا۔ حد تو یہ ہوئی کہ بہت سے پرانے اور معتبر لکھنے والوں پر انگلیاں تک اٹھائی جانے لگیں۔ نتیجتاً بہت سے لوگوں نے لکھنا کم کر دیا کئی لوگوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور کئی ایسے بھی ہوئے جو تحریک کے مخالف ہو گئے۔

اس نئے منشور کے پیش کردہ اور پارٹی کے زبردست حامی ڈاکٹر رام بلاس شرما کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری منتخب کر لیا گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک بہترین مشاعرہ بھی ہوا جس میں اردو ہندی کے مشہور شعرا نے حصہ لیا۔

متنازع منشور

(پانچویں کل ہند کانفرنس، بھیمڑی ۱۹۴۹ء میں منظور کیا گیا)

آج ہندوستانی ادب میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آج ترقی پسند اور رجعت پسند رجحانات بہت صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کشمکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان کی جنتا جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے کر رہی ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی عوامی جدوجہد نے ایک نیا رُخ بدلا۔ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ جو قومی تحریک کے زمانے میں بھی سامراج سے سمجھوتے کی کوشش میں برابر لگا ہوا تھا اب کھلم کھلا اس کا ساجھی اور دوست بن گیا۔ اس سمجھوتے کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ہند کی حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ ہندوستانی جنتا کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے عوام ایک آزاد اور خود مختار عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے۔

پچھلی لڑائی کو ختم ہوئے ابھی بہت دن نہیں ہوئے ایک دفعہ فاشزم کو شکست دینے کے بعد اب پھر دنیا کی عوام کو تیسری عالمگیر لڑائی کی نئی مجنونانہ تیاری میں لگایا جا رہا ہے اور ہندوستان کی جنتا کو بھی اس پھندے میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پچھلی لڑائی میں جمہوری طاقتوں نے سوویت یونین کی رہنمائی میں فاشزم

کے خلاف جو فتح حاصل کی تھی اس کی وجہ سے امن، جمہوریت اور اشتراکیت کے طریقوں نے بہت زور پکڑ لیا ہے لیکن برطانوی اور امریکی سرمایہ دار جو اپنے منافع کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ بڑھانا چاہتے ہیں اس بات کی سازش کر رہے ہیں کہ ڈالر اور ایٹم بم کے ذریعہ ساری دنیا کو غلام بنائے رکھیں۔ عوام کا معیار زندگی گرتا جا رہا ہے۔ ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں کا گمراہ طبقہ ایک نئی لڑائی کی فضا تیار کر رہا ہے۔ سویت یونین، پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کے جدو جہد کے بارے میں تہمتیں تراش کر اور جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں کو لڑائی کے لئے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ سامراجی طاقتیں ملایا کے عوام کو دبانے کے لئے پوری بربریت سے کام لے رہی ہیں اور برما، انڈونیشیا اور ویت نام میں مداخلت کر کے وہاں کے عوام کو آزادی حاصل کرنے سے باز رکھنا چاہتی ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ اور اس کی حکومت عوام پر ظلم و ستم ڈھا رہی ہے۔ ہزاروں آدمی جن میں مزدور، کسان، ادیب اور فنکار بھی شامل ہیں ہندوستانی قید خانوں میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان لوگوں کو قید کرنے سے پہلے رسمی طور پر عدالت کے سامنے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ کانگریسی حکومت ایک طرف لوٹ مار کرنے والے طبقہ کے مفاد کی حفاظت کرتی ہے، برطانوی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کے خلاف فوجی مرکز بنانے اور کامن ویلتھ کی

زنجیروں کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی ہیں، عوام کی شہری آزادی اور ان کے جمہوری حقوق کو سلب کرتی ہیں ۔ مزدوروں ، کسانوں اور متوسط طبقہ کی جدو جہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں اور دوسری طرف تہذیب وتمدن اور ادب کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرتی ہیں جو جرمنی اور اٹلی میں فاشسٹوں نے اختیار کیا تھا۔ مثلاً سوویت یونین کی فلموں پر پابندی لگائی جاتی ہے، خود ہندوستان میں ترقی پسند فلموں کے بنانے میں طرح طرح کی روکاوٹ ڈالی جاتی ہے لیکن امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے آنے والی سڑی گلی غیر جمہوری فلموں کو دکھانے کی پوری آزادی دیجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے پاس پورٹ چھین لئے جاتے ہیں اور ترقی پسند ملکوں سے تہذیبی اور سماجی تعلقات قائم کرنے کی ہر کوشش کو روکا جاتا ہے۔ یہ حکومتیں جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کررہی ہیں۔ لیکن بدیسی ایجنسیوں اور ہندوستانی اجارہ داروں کو پوری آزادی ہے کہ وہ سب کو اپنے جال میں پھنسائیں اور غیر جمہوری پروپگینڈہ کرتے رہیں۔

ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اظہار خیال کے لئے جدوجہد کریں، جمہوری رسالوں اور اخباروں کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل کر معیار زندگی کو اٹھانے اور تعلیم وتہذیب وتمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیں۔

ہماری آزادی کی لڑائی کے اس نئے دور میں ادب کے

اندر بھی دو رجحانات صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ادیب ہیں جو لڑائی اور سرمایہ دارانہ تشدد کی مخالفت کرتے ہیں، جو امن اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور جو پرانے ادب کی جمہوری روایات کو آگے بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو ہندستان کو سامراجیوں کی غلامی میں رہنے دینا چاہتے ہیں، جو سرمایہ دار حکومتوں کے ظلم و ستم کو سراہتے ہیں، جو دنیا کی جمہوری طاقتوں کے خلاف طرح طرح کی تہمتیں تراشتے ہیں اور جو پرانے ادب کی بہترین روایات کو ابھرنے سے روکتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان کسی طرح سمجھوتہ ناممکن ہے۔ جو ادیب ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر تیسرا گروہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں دراصل وہ عوام کو دھوکہ دیتے ہیں اور رجعت پسند ادیبوں کی عوام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندستان کا حکمران طبقہ خاص قسم کے تصورات کو پیش کر کے بہت چالاکی کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ عوام کے دماغ کو الجھن میں ڈال دے اور آج کے اصلی اور بنیادی مسئلوں سے ان کے دھیان کو موڑ دے۔ وہ ادیب جو سرمایہ داروں کے دست نگر ہیں "ادب برائے ادب" کا نعرہ بلند کرتے ہیں، ادب میں انفرادیت کو سراہتے ہیں اور ایسا ادب پیش کرتے ہیں جو عریاں، فحش اور سنسنی پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ اور اس طرح لوگوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ سوشلزم ادیب کی آزادی کو سلب

کرتا ہے اور سوویت یونین میں ادیبوں کو کسی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ عوام کو فریب دینے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ہندستان کی شان وشوکت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں طبقاتی کشمکش نہیں تھی اور اگر آج ہندستان کے لوگ گزشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان ہی کے راستہ پر چلیں اور مختلف طبقوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں۔

ان سب مسائل کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کا نقطۂ نظر واضح ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب میں انفرادیت، اسلوب پرستی اور اسی طرح کے دوسرے رجعت پرست رجحانات سرمایہ دار اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقہ کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کا ادب جو بظاہر سیاست سے الگ معلوم ہوتا ہے دراصل عوام کو نشہ پلا کر دھوکہ دیتا ہے اور ان کے دماغوں کو الجھائے ہوئے رکھنا چاہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں جمہوریت پسند ادیبوں کو اظہار خیال کی آزادی نہیں۔ سوویت یونین کے اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جا چکی ہے کہ وہ عوام کو دبا سکیں۔ اسی لئے وہاں جمہوریت پسند ادیبوں کو پوری آزادی ہے اور سوویت یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیب ماضی کے کلچر اور ادب کے صحیح وارث ہیں اور وہ انسانی تہذیب کی بہترین روایات کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ سماج کے تاریخی ارتقاء کے پس منظر میں وہ اپنے کلچرل ورثہ کو تنقیدی نظر

سے پرکھتے ہیں۔ وہ کلچر کو قومی تعصب اور تاریک اندیشی کا ہم معنی نہیں سمجھتے۔ وہ اس قسم کی تمام حرکتوں کا پردہ فاش کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے ادب کو احیاء پرستی کے رجحانات سے باز رکھیں۔

ترقی پسند ادیب جانتے ہیں کہ ظالم و مظلوم میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اس مسئلہ میں بیچ اور اہنسا کی بات کرنا ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی بربریت کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اپنی تحریک کی ابتدا ہی سے ترقی پسند ادیب کہتے آئے ہیں کہ سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں کوئی سمجھوتہ بازی نہ ہونا چاہئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی جدوجہد جنتا ہی چلا سکتی ہے۔ جب ۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی کی تحریک ناکام ہوئی اور انگریزی راج کے سائے میں کانگریسی لیڈروں نے وزارتیں قبول کیں تو قومی لیڈروں کی پالیسی کے متعلق ہندوستانی جنتا کے بہت بڑے حصے کی خوش فہمیاں دور ہوئیں اور سامراج کے خلاف ڈٹ کر لڑنے کے لئے انھوں نے اپنی طبقاتی تنظیمیں بنائیں۔ سامراج سے کسی قسم کا معاہدہ یا سمجھوتہ بازی نہ کرنے کا جذبہ بہت عام ہو گیا اور اس کا عکس اس وقت کے ادب میں ملتا ہے۔ اس خواہش نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں تنظیمی شکل پائی۔ سامراج کے خلاف جنگ میں ادب غیر جانب دار نہیں رہتا۔ مکمل آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد میں اسے کامیابی کے ساتھ جنتا کی رہنمائی کرنی چاہئے اور اس میں جوش پیدا کرنا چاہئے اس کا فرض ہے کہ وہ جنتا کی خواہشوں اور امیدوں کو

پیش کرے، جنھیں صرف بیرونی سامراج ہی نہیں لوٹتا بلکہ ہندستانی سرمایہ دار، جاگیردار اور رجواڑے بھی لوٹتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مقاصد جنھوں نے ترقی پسند ادب کی رہنمائی کی۔

اگر ہم پچھلے بیس سال کے ادب پر نظر ڈالیں تو بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اوروں کے مقابلہ میں ترقی پسند ادیب ہی تھے جنھوں نے اپنے ادب میں ہماری تحریک آزادی کے نئے موڑوں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے فاشسٹ طاقتوں کی جم کر مخالفت کی جو دنیا کو غلام بنانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے سویت یونین کی جنتا کے ساتھ جو فاشزم کے خلاف لڑ رہی تھی اپنی رفاقت کا اظہار کیا۔ جاپانی فاشزم کے خلاف لڑتی ہوئی چینی جنتا سے دوستانہ رشتہ قائم کیا۔ اور مغربی سامراج کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک جو جدو جہد کر رہے ہیں ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے قحط کے زمانے میں بنگال کے لئے ہندستان بھر کے لوگوں کو متحد کیا اور آزادی کی جنگ میں جس نے آگے چل کر ملاحوں کی شاندار بغاوت کا روپ اختیار کیا انھوں نے ہندوستانی جنتا کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ یہ ترقی پسند ادیب ہی ہیں جنھوں نے عوامی اتحاد اور امن کا پرچم بلند کیا جبکہ پورا سرمایہ دار پریس، فرقہ وارانہ فساد کو بڑھانے اور پھیلانے میں عملی حصہ لے رہا تھا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب میں خامیاں نہ ہوں اور ہم اسے اسی وقت آگے بڑھا سکتے ہیں جب ہم ان خامیوں کو سمجھیں اور دور کریں۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ترقی پسند ادب کی خاص کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے پوری طرح عام جنتا سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا، جس کی رہنمائی ہندستان کا مزدور طبقہ کرتا ہے۔ اسی

لئے ایسے تخلیقی ادب کی کمی محسوس ہوتی ہے جس میں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی جھلک ہو۔ اسی لئے ادبی تنقید ان مختلف رجعت پرست رجحانات کو ختم نہ کر سکی جنہوں نے صحت مند عوامی ادب کی ترقی میں رکاوٹ کا کام کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے کبھی کبھی رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتے بازی بھی کی اور ابھی تک خود ترقی پسند ادب پر کافی تنقید کو فروغ نہیں دیا جا سکا۔

ہندستانی ادب کا مستقبل مزدور طبقہ کی رہنمائی میں لڑتی ہوئی اس جنتا کے مستقبل سے الگ نہیں ہے جو ایک آزاد زندگی، مکمل آزادی اور خود مختاری، جمہوریت اور سوشلزم کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اور جو انسانی لوٹ کھسوٹ کے تمام طریقوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ہمارے ادیب اس تحریک کے جتنا نزدیک آئیں گے ان کے ادب میں صورت اور معنی دونوں اعتبار سے اسی حد تک گہرائی پیدا ہوگی۔

ادب کے رجعت پرست رجحانات جو عوام کے مفاد کی مخالفت کرتے ہیں ختم ہو کر رہیں گے۔ صرف عوامی ادب کا ہی مستقبل روشن ہے چاہے اس کی ترقی کی راہ میں آج کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں۔

کوئی ادب اس وقت تک عظیم نہیں ہو سکتا اور عوام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتا جب تک اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو۔ ترقی پسند ادب عظیم سماجی آدرشوں سے کسب نور کرے گا جیسے امن، محبت، قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش، انسان دوستی جو جنگ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی ہے۔

ادب کا یہ عظیم اخلاقی مقصد مطالبہ کرتا ہے کہ تمام ادیب اپنی تحریروں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کریں۔ ان میں تاثیر پیدا کریں۔ انھیں مقبول اور خوبصورت بنائیں تاکہ ہماری جنتا ان سے محبت کر سکے، ان سے جوش حاصل کر سکے اور ان پر فخر کر سکے۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ یہ مستقبل معتبر ہاتھوں میں ہے۔ ۳۵

maablib.org

چھٹی کل ہند کانفرنس، دہلی

۶، ۷، ۸ر مارچ ۱۹۵۳ء

بھیمڑی کانفرنس کے سخت فیصلوں اور اس کے ناخوشگوار نتائج نے ترقی پسند تحریک کو نہ صرف مجروح کیا بلکہ منتشر اور منجمد بھی کر دیا۔ دھیرے دھیرے تنظیم بھی کمزور ہوتی چلی گئی اور زیادہ تر معتبر اور سنجیدہ ادیب و شاعر اس کانفرنس (۱۹۴۹ء) کے اعلان نامہ سے اختلاف کرتے ہوئے کنارہ کش ہو گئے۔ عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، معین احسن جذبی حتیٰ کہ فیض احمد فیض تک کو کٹگھرے میں کھڑا کر دیا گیا اور ان کی ترقی پسندی کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا جو مقبول و معروف ادیب و شاعر ابھی تک ذمہ دار اور سنجیدہ ترقی پسند تسلیم کیے جاتے تھے اچانک بھیمڑی کانفرنس نے انھیں مشکوک بنا دیا۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اب وہ سب اس نئے مینیفسٹو کے تحت کام کریں (گویا کہ اب تک ان سب کی تحریریں ترقی پسند نہیں تھیں یا بے حد کمزور تھیں)۔ صرف اردو کے ہی نہیں بلکہ ہندی اور دیگر زبانوں کے بہت سے ادیب و شاعر بھی اس نئے اعلان نامے سے بیزار تھے اور ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ کہیں کہیں تو اسے رد بھی کر دیا گیا۔ ۳۶

بھیمڑی کانفرنس کے اس نئے اعلان نامے نے لوگوں کے بیچ جو نا اتفاقی پیدا کی تھی وہ تنظیمی سطح پر تو ضرور اثر انداز ہوئی مگر جو ادیب تحریک کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر سفر کر چکے تھے ان کے دلوں کے سکون کو چھین لیا۔ انھیں اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے محبت تھی، اس کے نعرے (ادب برائے زندگی) سے عقیدت تھی۔ پھر تنظیمی انتشار نے ان ادیبوں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا جو بھیمڑی منشور کے معمار تھے یا جو اس کے قائل و مقلد تھے۔ آخر کار متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ ایک کانفرنس بلائی جائے اور ان چار برسوں کا جائزہ لیا جائے۔ جو جو غلطیاں ہوئی ہیں ان پر نظر ثانی کر کے اسے سدھارا جائے کیونکہ یہ بات بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ تنظیم و تحریک اپنی ہی غلطیوں اور انانیت کا شکار ہوئی تھی۔

غرض کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۶، ۷، ۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو دہلی میں چھٹی کل ہند کانفرنس بلائی۔ اس کا اصل منشا بھیمڑی منشور (اعلان نامہ) کو رد کرنا اور نئے سرے سے تحریک و تنظیم کو مربوط و منظم کرنا تھا۔ اس کانفرنس کا انعقاد گاندھی گراؤنڈ دہلی میں کیا گیا۔ جس میں بڑی تعداد میں مندوبین نے شرکت کی۔

ظ انصاری نے اس کانفرنس کی روداد لکھتے وقت ابتدا میں لکھا:

> "یہ اجلاس جون ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد ہو رہا تھا اور ایسے حالت میں ہو رہا تھا جب کہ خود انجمن کے مختلف حلقوں میں بڑا خلفشار تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں جو مرکزی ادارہ چنا گیا تھا اس کا جلسہ بھی ان برسوں میں نہیں ہوا تھا۔ کسی شاخ کو یا انجمن کے کسی عام رکن کو دہلی پہنچنے تک یہ نہ معلوم تھا کہ کانفرنس میں کیا کیا مسائل درپیش ہوں گے اور اس کے متعلق خود اس کے صوبے یا شہر کی انجمن کی رائے کیا ہے۔ کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا ہے۔ کن سوالوں کو اٹھانا ہے اور کن پر بحث کرنی اور رپورٹ دینی ہے۔ سب خالی ہاتھ

آئے تھے اور بڑی حد تک خالی الذہن آئے تھے۔ سوائے ایک اہم احساس ضرورت کے۔ اس ضرورت کا احساس سبھوں کو معلوم ہوتا تھا کہ پچھلے تین برس کی حصار بندی کو توڑا جائے۔ بھیونڈی کانفرنس کے مینی فیسٹو کو آخری بار رد کر دیا جائے اس کی جگہ انجمن کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر منظم کیا جائے۔ ۳۷

کانفرنس کے پہلے ہی دن (۶ مارچ) صبح یہ اطلاع موصول ہوئی کہ سوویت یونین کے اشتراکی رہنما استالن کی موت ہو گئی ہے۔ اس لئے ایک تعزیتی رزولیوشن کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ اجلاس شام تک کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ یہ رزولیوشن استقبالیہ کمیٹی کے نائب صدر ڈاکٹر سلامت اللہ نے پڑھ کر سنایا۔

تعزیتی رزولیوشن

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس کامریڈ استالن کی اچانک اور بے وقت موت پر گہرے غم کا اظہار کرتی ہے۔ کامریڈ استالن جو آزادی اور امن کے رہنما اور کلچر و ادب کے محافظ تھے۔ یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ کامریڈ استالن کی موت سے دنیا کو نقصان عظیم پہنچا ہے۔ وہ ایک عظیم رہنما اور انسانی قدروں کے سرگرم حامی تھے۔ ان سے تحریک، اثر اور ہدایت لے کر سوویت ادیبوں، فنکاروں اور سائنسدانوں نے عوام کی خدمت کی اور دنیا بھر کے لئے ایک نئے راستے کو تابندہ کیا۔ یہ کانفرنس صدق دل سے سوویت عوام اور ان سب کے ساتھ پر خلوص ماتم میں برابر کی شریک ہے جو

دنیا بھر میں امن اور کلچر سے پیار کرتے ہیں۔ یہ کانفرنس ہندستانی ادیبوں کو آواز دیتی ہے کہ وہ امن اور کلچر کے تحفظ کے لئے اپنی کوششوں کو اور زیادہ مضبوط بنائیں اور کامریڈ استالن کی یاد کو تازہ رکھیں۔ ۳۸

اس لئے چھٹی کانفرنس کا باقاعدہ آغاز ۶ رمارچ کو شام کے اجلاس میں ہوا۔ مجلس صدارت کے لئے گوپال ہلدر (بنگلہ)، پروفیسر موہن سنگھ (پنجابی)، آل احمد سرور اور فراق گورکھپوری (اردو)، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا اور ناگار جن (ہندی)، واسودرن (کنڑ) اور ملک راج آنند (انگریزی) کے ناموں کا اعلان کیا گیا جن میں نرالا اور آنند اس وقت موجود نہیں تھے۔

استقبالیہ کمیٹی کے صدر انگریزی کے مشہور شاعر ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے تھے۔ مگر وہ خود جلسہ میں موجود نہ تھے۔ اس لئے ان کے خطبے کو نائب صدر ڈاکٹر سلامت اللہ نے پڑھ کر سنایا۔ استقبالیہ خطبہ کے بعد کئی بیرونی ادیبوں اور تنظیموں کے پیغامات پڑھے گئے جن میں روس کے ایلیا اہرن برگ اور کے سمونوف، امریکہ کے ہاورڈ فاسٹ، برطانیہ کے جیک لیزی، آسٹریلیا کی انجمن حقیقت پسند مصنفین، ہنگری کے لجوس کنیا (چیف سکریٹری یونین آف ہنگرین رائٹرز) اور چیکوسلواکیہ کے ادیبوں کے نام اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اندرون ملک کے بھی بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنے پیغامات بھیجے تھے، جن میں ڈاکٹر عابد حسین، پرفول دت گوسوامی، اشوک سین، وشنو پربھاکر، امرت رائے، مسز پریم لتا گپتا، اور سری سری اہم ہیں۔

کے سمونوف نے اپنے پیغام میں کہا:

"پیارے دوستو! سویت روس کے ادیبوں کی انجمن کی طرف سے ہندستان کے ترقی پسند ادیبوں کو ان کی چھٹی کانفرنس کے

موقع پر تہ دل سے سلام۔ اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے جان توڑ کر لڑنے والے عوام کے مقدس مقصد کی تکمیل میں ہندستان کے ترقی پسند ادیبوں کو کامیابی حاصل ہو، یہ ہماری دلی تمنا ہے۔ ۳۹ہے

ہاورڈ فاسٹ نے پیغام بھیجا:

"آپ ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے آپ کی مہربان دعوت بہت ہی دل افزا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مجھے یا کسی ترقی پسند امریکی کو ملک چھوڑنے کی اجازت نہیں اس لئے میں شرکت تو نہیں کر سکتا، بہر تو میرا دل میری امیدیں، میرے سارے بہترین ہمدردی کے جذبات آپ کے ساتھ ہیں۔ ۴۰ہے

جیک لیوے کا پیغام تھا:

"آپ کی چھٹی کانفرنس دنیا کی تاریخ کے ایک عظیم دور میں ہو رہی ہے۔ جس میں ہندوستان ایک بنیادی رول ادا کر رہا ہے۔ آپ لوگوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے عمل اور وسیع کارگزاریوں کو میں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس نیک کام کو جاری رکھئے۔ اپنے عوام، امن عالم اور ترقی کی خدمت کرتے ہوئے اپنی گراں بہا تہذیبی روایات کو زیادہ سے زیادہ بالیدگی بخشئے۔ ۴۱ہے

چیکوسلواکیا کے ادیبوں نے لکھا:

"پیارے رفیقو! چیکوسلواکیہ کے ادیبوں کو ٹکنیکل وجوہ کی بنا پر ہندستانی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہے۔ چیکوسلواکیہ میں ہندستان کے ترقی پسند ادیبوں کی تصنیفات کے ترجمے بہت ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

ہم کانفرنس کی کامیابی کے خواہاں ہیں۔'' ۴۳

ہندستانی ادیبوں کے جو پیغامات آئے تھے ان میں بھی نے کانفرنس کی کامیابی کی دعا کی تھی اور خود شرکت نہ کر پانے پر افسوس ظاہر کیا تھا۔دہلی سے وشنو پربھاکر نے جو پیغام بھیجا تھا وہ کانفرنس کے پس منظر کو ظاہر کرتا ہے۔انھوں نے لکھا تھا:

''میں تمنا رکھتا ہوں کہ سب ملیں اور جو دوری ہے اسے مٹانے میں کامیاب ہوں۔'' ۴۴

پیغامات کے بعد مجلس صدارت کے لوگوں نے تقریریں کیں۔سب سے پہلے بنگال کے مشہور و معروف ادیب گوپال ہلدر مائک پر آئے انھوں نے مشفقانہ لب و لہجے میں کہا کہ ترقی پسند ادب دراصل وہ ادب ہے جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دے۔ہمیں اپنے ادب کو انسان کی بہبودی اور امن کی حمایت کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔انھوں نے کہا کہ موجودہ سماج میں ترقی پسند ادیبوں کو اپنے فرائض سے آگاہ ہونا چاہئے۔ان کی یہ تقریر انگریزی میں تھی اور کافی طویل بھی۔باوجود اسکے سنجیدگی سے سنی گئی۔

دوسری تقریر پروفیسر آل احمد سرور کی تھی۔جنھوں نے قومی کلچر اور ادب کے رشتے کو تقریر کا موضوع بنایا۔انھوں نے کہا کہ ادب کا مقصد عوام کی خدمت ہے اور قومی تہذیب کو بہتر بنانا،اسے فروغ دینا اور مالا مال کرنا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان ایک مکمل زبان ہے جو پھل پھول رہی ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔(چونکہ اردو ہندی کا تنازعہ تقسیم ہند کے بعد کافی شدت اختیار کر چکا تھا اور تنگ نظری اور تعصب کی بنا پر حملے بھی شروع ہو چکے تھے،اس لئے پروفیسر سرور نے اس کا ذکر ضروری سمجھا۔)

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک تقریر کی،انھوں نے کہا:

''آج کی ابتری اور بحران کے دور میں انسان کی بہترین قدریں خطرے میں ہیں۔تہذیب کو مسخ کیا جا رہا ہے۔انتہائی گندگی،پست،فحش اور وحشت انگیزی کی تحریریں پھیلا کر اور لوگوں

کے ذہن کو جنگی جراثیم سے زہر آلود کر کے تہذیب کے غلط معنی لئے
اور پھیلائے جا رہے ہیں ہمارا فرض یہ ہے کہ اس زہر کے لئے تریاق
لائیں اور صحت مند اور Positive طریقوں سے، اپنے ادب کی
بہتر قدروں اور طاقتوں کے ذریعہ سے اس مہم کا مقابلہ کریں۔" ۴۴

ڈاکٹر عبدالعلیم کے بعد پروفیسر موہن سنگھ، ناگارجن اور وداسوورن وغیرہ نے بھی تقریریں کیں اور پہلا دن ختم ہوا۔ جلسہ ختم ہونے سے قبل سکریٹری نے رپورٹ کی کاپیاں تقسیم کیں۔

دوسرے دن جلسہ شروع ہونے سے پہلے فراق گورکھپوری کی صدارت میں ایک عارضی اور غیر رسمی سی نشست ہوئی وجہ یہ تھی کہ کم از کم یہ طے کرلیا جائے کہ کانفرنس میں کن کن مسئلوں پر بحث کی جائے گی۔ (جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے کہ زیادہ تر مندوبین خالی الذہن اور بغیر منصوبہ کے آئے تھے) اس میٹنگ میں زیادہ تر اردو اور ہندی کے ادیب شامل تھے۔ اس میں اردو اور ہندی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ بہرحال اصل جلسہ شروع ہوا اور سب سے پہلے ڈاکٹر رام بلاس شرما (۱۹۴۹ء سے انجمن کے جنرل سکریٹری) نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ (یہ وہی رپورٹ ہے جو پہلے اجلاس میں تقسیم کی جا چکی تھی اور جس پر بحث کی جانی تھی) اس میں پچھلے سترہ سال کا جائزہ تھا، مختلف اعتراضات کے جوابات تھے اور مستقبل کی کچھ تجویزیں بھی۔ انھوں نے رپورٹ میں کہا:

> "اس مختصر سے (۱۷ سال) عرصہ میں ترقی پسند ادیبوں
> کی تحریک نے ہندوستانی عوام کی تہذیبی زندگی میں اپنے لئے ایک
> جگہ بنالی ہے۔ ہمارے ملک میں اس سے پہلے کوئی ادبی تحریک اتنی
> تیزی سے نہیں پھیلی تھی اور اتنی طاقتور نہیں ہوئی تھی جتنی یہ ہوئی
> ہے۔" ۴۵

ترقی پسند ادب کے بارے میں کہا:

"ادب ترقی پسند بھی ہے، رجعت پرست بھی، عوام کا حامی بھی ہے اور ان کے دبانے والوں کا حامی بھی۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ ادب سب کی برابر خدمت کرتا ہے اور اس کے درمیان امتیاز یا تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ جمہوری اور غیر جمہوری ادب کے درمیان فرق ہونے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل ادب میں خیالات کی اہمیت کے منکر ہیں۔ ایسے لوگ فن برائے فن کے حامی ہوتے ہیں، جو نہ ہماری ادبی روایت سے میل کھاتا ہے اور نہ عوام کے لئے مفید مطلب ہے۔...... ترقی پسند مصنفین کی انجمن ان مصنفوں اور ادیبوں کی انجمن ہے جو قومی اور جمہوری ادب پیدا کرتے ہیں اس لئے اگر محض ادیبوں یا مصنفوں کی انجمن بنے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب کی دونوں قسموں کے درمیان جو فرق آج موجود ہے اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔" ۳۶

ترقی پسند ادب اور ادیبوں پر لگائے جانے والے الزام کے بارے میں انھوں نے کہا:

"مثلاً یہ کہ لوگوں کی معاشی مشکلات کا بیان کرنا، مزدوروں کو ہڑتال پر اکسانا ہی ترقی پسندی ہے۔ یا یہ کہ ترقی پسند ادیب پرانے تہذیبی ورثہ کو اپنانے کے خلاف ہیں۔ یا یہ کہ ترقی پسند ادب بدیسی ادب کی نقالی کرتا ہے، یا یہ کہ ترقی پسند ادب میں جنسی تعلقات اور عریانی کا بیان ہوتا ہے اور اخلاقی احتیاطوں کو ٹھکرایا جاتا ہے۔ یا یہ الزام کہ انھیں صرف روٹی سے غرض ہے زندگی کی دوسری اعلیٰ قدروں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ یا یہ غلط بیانی کہ ترقی پسند

ادیبوں کو موضوع اور مضمون کی زیادہ فکر رہتی ہے وہ فن کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا یہ الزام کہ صرف کمیونسٹ ہی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ یا یہ کہ ترقی پسند ادیب ہونے کے لئے آدمی کو دہریہ یا خدا کا منکر ہونا لازمی ہے۔ یہ تمام الزامات غلط ہیں اور تحریک کے مخالفین کے پھیلائے ہوئے ہیں۔'' ۴۷

ادیبوں سے اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے کہا گیا:

''بہت سے وطن دوست ادیب ایسے ہیں جو رجعت پرست نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ہماری انجمن میں بھی شامل نہیں ہیں، ہم ان سے انجمن کے باہر بھی اور اندر بھی اتحاد چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے خیال میں مل کر کام کرنا دونوں کے لئے مفید ہوگا۔'' ۴۸

رپورٹ کے آخر میں تنظیم کے متعلق باتیں کہی گئی تھیں۔ رپورٹ پڑھ لینے کے بعد حاضرین کو دعوت دی گئی کہ وہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ بحث کا آغاز ڈاکٹر محمد حسن نے کیا اور کہا کہ رپورٹ میں تحریک کے ادبی منصب پر بہت کم بات کی گئی ہے اور خامیوں سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ رپورٹ مکمل نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف خیالات پیش کئے گئے ہیں اور جائزہ کہیں نہیں لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے آگے کہا:

''ترقی پسند تحریک کی ادبی حیثیت کو فراموش کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خام سیاسی رنگ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے اور بالآخر غیر موزوں اشعار، بے رنگ و سپاٹ افسانے اور غیر ادبی تنقیدیں صرف اس لئے سر آنکھوں پر لی گئیں کہ ان میں ہنگامی سیاسی نعرے موجود تھے۔ ادب میں سیاسی مسائل کی اہمیت ضرور ہے لیکن ادبی روپ اور حسن کے ساتھ۔'' ۴۹

انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ تنظیمی ذمہ داریاں اب ان لوگوں کو دوبارہ نہ سونپی

جائے، جن پر پچھلے چند برسوں میں غلطیاں کرنے اور انجمن کی طرف سے لاپروائی برتنے کا الزام ہے۔ محمد حسن کے بعد بنگلہ نمائندے سری نرائن جھا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد فراق گورکھپوری نے کہا:

''ہم روز بروز ادبی حسن سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور کھردرے پن کو بھی اچھے ادب میں اس لئے شامل کرنے لگے ہیں کہ اس کے معنی اچھے ہیں اور اس کا موضوع سماجی یا سیاسی ہے........ بھلا یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہے کہ کسی کے ادب کے بارے میں کہا جائے کہ ہاں صاحب، بات تو اچھی کہی مگر بھدے طریقہ سے کہی گئی۔ ایسی اچھی بات کا اثر کیا خاک ہوگا جس میں اثر نہیں اسے آپ ادب کیونکر شمار کرلیں گے۔'' ۵۹

ظ. انصاری نے تحریک اور تنظیم کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس تحریک اور تنظیم دونوں کا الگ الگ تجزیہ کرنا چاہئے۔ ہماری تنظیم تحریک کے مقابلہ بہت کمزور رہی ہے۔ ترقی پسند ادب نے جو برگ و بار پیدا کئے ہیں یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے، تو یہ صرف تحریک کی دین ہے، تنظیم کی نہیں، انھوں نے بھی رپورٹ کو ناقص مانا اور کہا کہ :

''رپورٹ کی اس تجویز کو نہ ماننا چاہئے کہ ضرورت ہو تو ہر زبان اپنا الگ مینی فیسٹو بنالے۔ اگر اس کانفرنس کو ایک متحدہ محاذ اور زیادہ وسیع بنیاد ڈالنی ہے تو سب زبانوں کے ترقی پسندوں کا ایک مشترکہ مینی فیسٹو ہونا چاہئے، جس سے بنیادی مسائل پر سب کا اتفاق ہو۔ تبھی یہ کانفرنس ایک وسیع اتحاد کی بنیاد ڈال سکتی ہے۔'' ۶۰

ظ. انصاری نے کانفرنس میں ہونے والی بحث کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :

''اس کے بعد چند نوجوان ادیبوں نے اور شدت سے

کام لیا۔ کئی ڈیلی گیٹوں نے خاص طور سے ایک راجستھانی اور ایک بہاری ادیب نے اس نکتہ پر زور دیا کہ انجمن کو کمیونسٹ پارٹی کا ایک بازو بن کر کام نہ کرنا چاہئے بلکہ اسے صرف ادبی محاذ ہونا چاہئے۔ اب تک چونکہ سیاست کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور ترقی پسند مصنفین کی پالیسی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کے تحت رہی ہے اس لئے ادب کو نقصان پہنچا ہے۔

یہاں پہنچ کر جذبات اور گرم ہو گئے۔ بعد میں دو مقرروں نے سوال کیا کہ اگر ترقی پسند مصنفین میں بعض اچھے ادیب کمیونسٹ ہوں یا اگر کمیونسٹ ادیبوں کا اثر واقتدار ان کی خدمات کی وجہ سے بڑھ جائے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انجمن کمیونسٹوں کا ایک بازو ہے؟ یا ان کی مٹھی میں ہے؟

تقریباً ۱۴ ڈیلی گیٹوں نے اپنے خیالات ظاہر کئے اور بہت کھل کر ظاہر کئے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہے جہاں انجمن کے ذمہ دار لوگوں پر اتنی لے دے ہوئی ہے اور عام ادیبوں نے اپنے خیالات ظاہر کرنے میں اتنی جرأت اور بے لاگ تنقید سے کام لیا ہے۔ جو ایک خوشگوار علامت تھی۔ تنقید کا زیادہ تر نشانہ رام بلاس شرما تھے اور بعض مقرروں نے تو اسٹیج سے یہاں تک اشارہ کیا کہ ان کی اور ان کے دوستوں کی بدولت آج کانفرنس میں ہندی کے زیادہ تر ادیب نہیں آئے، جنھیں یہاں ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما اس دوران اسٹیج پر پرسکون بیٹھے تھے اور مشتعل ہونے کے بجائے مسکرائے جا رہے تھے۔" ۵۲

رام بلاس شرما نے اپنی یا تنظیم کی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ آخر میں علی سردار جعفری نے زیادہ تر سوالوں کے جواب دیئے۔ وہ لیڈرشپ کی بچاؤ میں بھی آئے اور رپورٹ کو کمزور مانتے ہوئے اس کے اسباب بھی گنائے، انھوں نے کہا کہ ہماری تنظیم واقعی کمزور ہے اور تحریک کو سمیٹ نہیں سکی ہے۔ اسی وجہ سے ہم مختلف زبانوں کے کام کی رپورٹ نہیں منگوا سکے اور رپورٹ نامکمل رہ گئی۔

اسی رات ایک زبردست مشاعرہ بھی ہوا، جسکی صدارت جگر مرادآبادی نے کی۔ سامعین کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی جو رات ساڑھے نو بجے سے لے کر صبح چار بجے تک اپنے پسندیدہ شاعروں کو سنتے رہے اور جھومتے رہے۔ مشاعرے کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایک ہی اسٹیج پر اردو، ہندی اور پنجابی کے ہردلعزیز شاعر یکجا تھے۔ اردو کے شاعروں میں جگر مرادآبادی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، آل احمد سرور، گلزار دہلوی اور فراق گورکھپوری وغیرہ شامل تھے۔

کانفرنس کے آخری دن (۸ر مارچ) ایک اعلان نامہ پاس کیا گیا جس نے ۱۹۴۹ء کے منشور کو منسوخ کر دیا۔ یہی پورے کانفرنس کا ماحصل تھا۔ اعلان نامہ کے بعد انتظامیہ کونسل کا انتخاب ہوا۔ ۲۱ رکنی کونسل میں اردو کے راجیندر سنگھ بیدی، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین ممبر چنے گئے۔ کرشن چندر کو ڈاکٹر رام بلاس شرما کی جگہ جنرل سکریٹری چنا گیا۔ آخر میں کچھ قراردادیں پیش ہوئیں۔

بہت سے الجھے سوالوں کو بغیر سلجھائے یہ کانفرنس ختم ہو گئی، یہ کہتے ہوئے کہ اسے انتظامیہ کونسل سمجھ لے گی۔ مگر مینی فیسٹو کی شکل میں اس کانفرنس نے سب کو ایک بہترین تحفہ دے دیا تھا اور سب لوگ اس سے متفق و متحد ہو کر جلسہ گاہ سے باہر نکلے۔

اعلان نامہ

(چھٹی کل ہند کانفرنس، دہلی ۱۹۵۳ء میں منظور)

ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ادب اور آرٹ ان کی قومی روایات کے مطابق ترقی کرے۔ تمام وطن دوست ادیب وفنکار عوام کے اس جائز اور صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کاوشوں کے ذریعہ ہر اس چیز کو ترقی دینا چاہتے ہیں جو ہمارے تہذیبی ورثہ میں خوبصورت اور شاندار ہے اور ہر وہ چیز جو فرسودہ، بے جان اور زوال پذیر ہے اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

ہمارے عوام کی خواہش ہے کہ ایک آزاد اور خوش حال زندگی انھیں حاصل ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور برادرانہ امن قائم رکھیں۔ ہمارا ادب انسان دوستی کے جذبے کا، زندگی پر یقین اور اعتماد کا اور روشن مستقبل کی امیدوں کا علمبردار ہے۔

یہ بات ہمارے عوام کی صحت مند روایات کے خلاف ہے کہ انسان کی تخلیقی قوتوں کو حقارت سے دیکھا جائے، ایک قوم یا نسل کو دوسری پر غالب یا برتر سمجھا جائے، نسل اور فرقہ کی بنیاد پر نفرت پھیلائی جائے۔

بے مقصد زندگی، شکست پسندی، فنا پسندی اور جبر پرستی ایسے رجحانات ہیں جو ہماری تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں، ہم اس ادب کے مخالف ہیں جو عریانی، فحاشی، وحشت پسندی اور

غارت گری پھیلاتا ہے، ہمارا ادب فنی اعتبار سے خوبصورت ہونا چاہئے، قومی اور عام پسند ہونا چاہئے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے کے لئے تمام سہولتیں دی جائیں۔

ہم تمام ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ عوام کی خدمت کے لئے متحد ہوں اور خوش حال اور پر بہار زندگی کی تعمیر میں اپنی فنی کاوشوں کے ذریعہ ان کی مدد کریں۔" ؎۳

تجاویز

(چھٹی کل ہند کانفرنس ۱۹۵۳ء میں منظور)

۱۔ سجاد ظہیر اور فیض کی رہائی کے بارے میں

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس اس بات پر غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کرتی ہے کہ پاکستان حکومت نے سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو، جو نامور ادیب ہیں اور پاکستانی عوام کے تہذیبی رہنما ہیں، طویل سزائیں دی ہیں۔ ہم ہندستانی ادیب اپنے ان بڑے ادیبوں اور ساتھیوں کے ساتھ محبت اور دوستی کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ ایک بند عدالت میں جس عجیب و غریب ڈھنگ سے ان کے مقدمے کی سماعت کی گئی ہم اسے بڑی تشویش اور فکر سے دیکھتے رہے ہیں۔ اور ہم بلا شک و شبہ کہہ سکتے ہیں کہ مقدمے کی تمام کاروائی محض ایک ڈھونگ تھی اور ان دونوں ادیبوں کو جو سزا دی گئی ہے وہ غیر منصفانہ اور وحشیانہ ہے اور انصاف اور قانون کی انسانی اقدار کے منافی ہے۔

اس لئے یہ کانفرنس پاکستان سرکار سے اپیل کرتی ہے کہ اب بھی وہ اپنا یہ فیصلہ واپس لے اور سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو رہا کرے۔ کانفرنس پیارے سجاد اور فیض کو جیل میں سلام بھیجتی ہے اور امید کرتی ہے کہ وہ اپنے عوام کی خدمت کے لئے اور ہماری دونوں قوموں کے درمیان امن قائم کرنے کے لئے جدو جہد کر

رہے ہیں اس میں انھیں کامیابی ہوگی۔

۲۔رشید جہاں اور صفیہ اختر کی تعزیت کے بارے میں

ڈاکٹر رشید جہاں اور پروفیسر صفیہ اختر ان خواتین میں سے تھیں جنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات اور محنتوں کو ادب کی ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا۔ان کی قلمی کاوشیں،ان کی تحریریں اور ان کی زندگی ہندستانی خواتین کے لئے مشعل راہ ہے۔ہم ترقی پسند مصنفین ان پر فخر کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔روسی اور چینی ادب پر سے پابندی ہٹانے کے بارے میں

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس حکومت ہند کے اس رویہ کو قطعی ناجائز اور رجعت پرست سمجھتی ہے کہ اس نے حال ہی میں ریلوے بک اسٹالوں پر روسی اور چینی ادب کی نمائش اور فروخت کی ممانعت کردی ہے۔

واضح رہے کہ کانفرنس کتابوں کی دوکانوں اور خصوصاً ریلوے بک اسٹالوں پر ہر قسم کی پابندی کے خلاف نہیں ہے۔آج کل ان پر غلیظ،فحش اور عوام دشمن کتابوں،پمفلٹوں اور رسالوں کی بھرمار رہتی ہے۔اگر اس قسم کے ادب کی نمائش کو روکا جائے تو ہمیں خوشی ہوگی۔مگر روسی اور چینی لٹریچر اس ضمن میں نہیں آتے۔چنانچہ کانفرنس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ روسی اور چینی ادب پر سے یہ پابندی ہٹائے اور ملک کی جمہوری رائے کا احترام کرتے ہوئے متذکرہ بالا فحش اور غلیظ ادب کی اشاعت کی روک تھام کرے۔

۴۔ صوبوں کی تشکیل لسانی اعتبار سے کرنے کے بارے میں
کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس چھٹے اجلاس کی رائے ہے کہ ہمارے دیس کی مختلف قومیتوں کے ادب اور کلچر کی ترقی اور ارتقا کے لئے لسانی اعتبار سے صوبوں کی تقسیم نہایت ضروری ہے، اس لئے کانفرنس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں فوری اقدام کرے۔

۵۔ یو. پی. کے ٹیچروں کی جدوجہد کے بارے میں
یہ کانفرنس اتر پردیس کے استادوں اور استانیوں کی تکلیف دہ جدوجہد کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس خبر سے سخت بے چینی کا احساس پیدا ہوا کہ جو لوگ بھوک ہڑتال پر ہیں ان میں سے بعض کی حالت خطرناک ہے۔ کانفرنس یو. پی. کے پرائمری ٹیچروں کو ہدیۂ تہنیت بھیجتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے انسانی معیار زندگی کی جدوجہد میں انھیں کامیابی حاصل ہو۔
کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ٹیچروں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرے اور عوام کی خدمت کرنے والی قیمتی جانوں کو بچائے۔

۶۔ آل انڈیا ریڈیو کی غیر جانب داری کے بارے میں
کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس کانفرنس کی رائے ہے کہ آل انڈیا ریڈیو جیسے قومی ادارے کو برسر اقتدار پارٹی کے پروپیگنڈے کے لئے اور ایسے پروپیگنڈے کے لئے جسے صرف موجودہ حکومت پسند کرتی ہے استعمال نہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ کانفرنس آل انڈیا

ریڈیو کی اس پالیسی کی مذمت کرتی ہے کہ سوائے چند ایک کے اس نے ترقی پسند ادیبوں کو اپنے نشری پروگرام سے خارج کر رکھا ہے۔

اس لئے کانفرنس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ تمام پارٹیوں پر مشتمل ایک بورڈ بنائے جس میں پارلیامنٹ کے ممبر اور مختلف زبانوں کے نمائندہ ادیب شامل ہوں۔ یہ بورڈ آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی طے کرے۔

۷۔ کاپی رائٹ ایکٹ کے بارے میں

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ چھٹا اجلاس ہندوستان اور پاکستان کے ان ناشروں کی مذمت کرتا ہے جو ادیبوں کو معاوضہ دیئے اور اجازت لئے بغیر ان کی کتابوں کو چھاپ لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانفرنس کی یہ متفقہ رائے ہے کہ ہندستان اور پاکستان کی حکومتیں کاپی رائٹ کے سلسلہ میں فوراً ایک معاہدہ کریں تاکہ ادیبوں کا جو معاشی استحصال کیا جا رہا ہے وہ ختم ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی کانفرنس یہ مطالبہ کرتی ہے کہ بین الاقوامی کاپی رائٹ ایکٹ کو دونوں ملکوں میں رائج کیا جائے۔ یہی ایک راستہ ہے جو ادیبوں کی مالی حالت سدھارنے میں کسی حد تک مدد کر سکتا ہے۔

۸۔ ترقی پسند مصنفین کی میٹنگوں میں شرکت پر لگی پابندی کو ہٹانے کے بارے میں

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ حکومت ہند اور صوبائی سرکاروں نے اپنے ملازمین پر یہ پابندی لگا دی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگوں اور تقریبوں میں

شریک نہ ہوں۔ اس پابندی کے باعث بہت سے وطن دوست اور پرخلوص ادیب ہماری سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ یہ کانفرنس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس پابندی کو ہٹا کر اپنی ادب دوستی کا ثبوت دے۔

۹۔ تہذیبی لین دین کے بارے میں

یہ کانفرنس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں تہذیبی لین دین کے لئے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائے۔ اس سے قوموں میں دوستی کے رشتے استوار ہوں گے اور ایشیا اور تمام دنیا میں امن کی فضا قائم ہوگی۔

۱۰۔ رسالہ 'یونٹی' کے بارے میں

یہ کانفرنس طے کرتی ہے کہ انگریزی رسالہ 'یونٹی' (کلکتہ) کو جو اپٹا کا پرچہ ہے اب انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی پرچہ سمجھا جائے، اور اس کے اشاعتی معاملوں کا فیصلہ ہر دو جماعتوں کی کمیٹیاں کریں۔ ۵۳

maablib.org

ساتویں کل ہند کانفرنس، دہلی

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۱ر جنوری ۱۹۶۷ء

بھیمڑی منشور نے انجمن وتحریک میں جو انتشار و جمود پیدا کیا تھا اسے توڑنے کے لئے چھٹی کل ہند کانفرنس ۱۹۵۳ء کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر کو جنرل سکریٹری چنا گیا تھا اور خیال تھا کہ کرشن چندر کی محنت اور ادیبوں و شاعروں کی لگن سے تنظیم اور تحریک پھر سے مضبوط اور توانا ہو جائے گی۔ مگر کرشن چندر کا رجحان زیادہ تر فلموں کی طرف ہو گیا اور وہ اپنے عہدے کو لے کر سنجیدہ نہیں رہ پائے۔ نتیجتاً تحریک پر پھر وہی سستی اور جمود طاری ہو گیا۔ کل تیرہ سال بعد (ایک طویل مدت) انجمن نے دہلی ہی میں ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی اور ایک بار پھر سے تحریک کو سنوارنے و نکھارنے کا عزم و عہد کیا۔

اس کانفرنس میں ہندستان کے کونے کونے سے مشہور و مستند ادیب و شاعر و دانشور شریک ہوئے نیز روس اور دیگر ممالک کے بھی کئی مقتدر ادیبوں نے اس میں شرکت کی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو سپرو ہاؤس نئی دہلی میں ہوا۔ دہلی کے چیف ایکزیکیوٹیو کاؤنسلر میر مشتاق نے مندوبین کا استقبال کیا۔ اور مشہور مورخ و دانشور

پروفیسر نہار رنجن رائے نے سب کو خطاب کیا۔ اس کانفرنس کی مجلس صدارت میں اردو کے ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر احتشام حسین، ہندی کے امرت رائے اور ڈاکٹر پی. سی. گپتا، پنجابی کے امرتا پریتم، پروفیسر سجان سنگھ اور پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں، انگریزی کے بیانی بھٹاچاریہ، گجراتی کے گلاب داس بروکر، بنگالی کے سبھاش مکھوپادھیائے، آسامیا کے پروفیسر ہمنت لاکھر اور سندھی زبان کے اے۔ جے۔ اتم شامل تھے۔

۲۹ دسمبر کو یہ اجلاس بجائے سپرو ہاؤس کے رفیع مارگ پر واقع وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس کے ہال میں ہوئے۔ پہلا جلسہ ''جدید ہندستانی فکشن'' کے موضوع پر تھا۔ جس کی صدارت امرت رائے نے کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ''جدید اردو ناول'' پر اور ڈاکٹر رام گوپال سنگھ چوہان نے ''جدید ہندی ناول'' پر مقالہ پڑھا۔ ان پرچوں پر بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ علی سردار جعفری نے راجیندر سنگھ بیدی کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ترقی پسندوں نے اردو فکشن کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ امرت رائے نے صدارتی تقریر میں کہا کہ بغیر عوام کے یقین کو حاصل کئے ہوئے ہم سوشلزم اور کمیونزم کی باتیں نہیں کر سکتے۔ عوام سے میل جول کے بغیر کوئی بھی ادیب یا فنکار اچھی تخلیق نہیں دے سکتا۔

دوسرا اجلاس 'جدید معاشرہ میں ادیب کی ذمہ داریاں' کے موضوع پر ہوا۔ اس میں ہنس راج رہبر کی کتاب ''ترقی پسند تحریک: ایک جائزہ' زیر بحث رہی جس نے ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کو مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا اور انہیں غلط اور انتہا پسند ثابت کرنے کی یک طرفہ کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند نے 'جدید سوسائٹی میں ادیب کی ذمہ داریاں' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ:

> ''عہد حاضر کی زندگی کے فوری تقاضے بہت صاف اور واضح ہیں، منزل تک پہنچنے اور ان ناگفتہ بہ حالات سے نکلنے کی جد وجہد جن میں ہمارے اجنبی آقاؤں نے کئی نسلوں تک ہم کو جکڑے

رکھا اور پھر اس دنیا کو ذلت اور انحطاط کے اس گڑھے سے نکالنے کی کوشش جس میں وہ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال اور منافع خوری کے نظام کی وجہ سے کی گئی ہے...... یہ سب ایسے تقاضے ہیں جو ہمارے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں اور تبدیلی کی ضرورت کا احساس ہمارے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ایک ادیب یا فنکار کے ذہن میں تبدیلی کا کوئی میکینکی تصور نہیں ہوتا، وہ اپنے تخلیقی فن پاروں کے ذریعہ زندگی کا روپ بدلنا چاہتا ہے۔ جس کا اثر دوسروں کے احساس کی تہوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح تخلیقی آرٹ اور ادب پوری شدت کے ساتھ افراد اور گروہوں کے باہمی تعلقات کا انکشاف کرتا ہے اور انسانی ضمیر کی مختلف سطحوں کو حرکت میں لاتا ہے۔" ۵۵

۳۰ ر دسمبر کے پہلے اجلاس کا موضوع "مختلف ہندوستانی زبانوں میں ادبی تنقید کی ارتقا" تھا۔ گجراتی کے ادیب اے۔ جے۔ اتم نے اس کی صدارت کی۔ ہندی کے ناقد پروفیسر پی۔ سی۔ گپتا کی تقریر سے اس جلسے کا آغاز ہوا۔ کل بیر سنگھ نے پنجابی تنقید پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر احتشام حسین اور ایک بنگالی ناول نگار بھانی سین گپتا نے تقریریں کیں۔ قاضی عبدالستار نے بزرگ ناقدوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ یہ لوگ اپنی ذمہ داریاں سنجیدگی سے نہیں نبھارہے ہیں۔ سردار جعفری نے ان الزامات کی تردید کی۔

دو پہر کا اجلاس "شاعری اور ڈرامے کے رجحانات اور سمت و رفتار" سے متعلق تھا۔ روس کے نوجوان شاعر رابرٹ روژدیسٹونسکی نے اپنی تقریر میں، اپنی شاعری کے ماخذ و محرکات پر روشنی ڈالی۔ امریکہ سے آئے ہوئے شاعر لیونارڈ ناتھن نے امریکہ کی ہم عصر شاعری پر باتیں کیں۔ یوگوسلاویہ کی محترمہ اولیوجس نے یوگوسلاویہ کی عصری شاعری پر مختصر مگر دلچسپ مضمون پیش کیا۔ ہندی کے شمشیر بہادر سنگھ نے جدید ہندی شاعری پر ایک طویل مضمون پڑھا۔ راجستھانی ادیب مردل نے راجستھانی شاعری پر اور حیدرآباد کے نوجوان شاعر راشد آذر نے

اردو کی عصری شاعری پر مقالہ پڑھا۔ ان سب کے علاوہ پراگ جی ڈوسانے جدید گجراتی ڈرامہ پر، سبھاش مکھوپادھیائے نے بنگال کے ترقی پسند ادب پر اور پروفیسر نرور کرنے جدید مراٹھی شاعری پر مقالے پڑھے۔ تقی حیدر نے بھی جدید شاعری پر ایک مقالہ پیش کیا۔

۳۱ دسمبر کے دونوں اجلاس "انجمن ترقی پسند مصنفین : کامیابیاں، کوتاہیاں اور مستقبل" کے عنوان سے مختص تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت آسام کے پروفیسر ہنت لاکھر نے کی۔ جلسے کی شروعات انور عظیم کے پرچے سے ہوئی۔ جس میں انھوں نے کچھ ایسے معمر ترقی پسند ادیبوں پر تیکھے حملے کیے، جنھوں نے انجمن کو، تنظیم کو گزشتہ کچھ برسوں سے نظر انداز کر رکھا تھا۔ جس سے تنظیم اور تحریک دونوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ انور عظیم نے اردو کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے حق میں بات کرنا صرف اردو والوں کا ہی نہیں بلکہ سارے ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے۔ مہیندر ناتھ نے انور عظیم کے سوالوں کا منطقی طریقے سے جواب دیتے ہوئے ان کے بہت سے الزامات کی تردید بھی کی۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک پر ایک تنقیدی مضمون پڑھا۔ امرت رائے اور راشد آذر نے بھی اپنے اپنے مقالے پڑھے۔ ان اجلاس میں جن لوگوں نے بحث ومباحثہ میں حصہ لیا ان میں پروفیسر ست سنگھ سیکھوں، مہیندر ناتھ، ہنس راج رہبر، حبیب تنویر، موہن لال سکھی، کرن جیت سنگھ، سریندر پرکاش، نجم الحسن، بچھن شاستری، ہنت لاکھر، وچیندر نندھوپادھیائے اور نریندر نشچل وغیرہ اہم تھے۔

پہلی جنوری ۱۹۶۷ء کو اس کانفرنس کا آخری اجلاس تھا۔ جس میں نیا اعلان نامہ، نیا دستور اور بعض قراردادیں منظور ہوئیں۔ مجلس عاملہ کا انتخاب بھی ہوا۔ سجاد ظہیر کو کرشن چندر کی جگہ انجمن کا نیا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ ڈاکٹر نامور سنگھ، کرن جیت سنگھ، اور تقی حیدر جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے اور کے۔ دامودرن کا انتخاب خزانچی کے طور پر ہوا۔ اب انجمن کا مرکز بمبئی سے دہلی کر دیا گیا۔

اس کانفرنس نے اردو کے لئے ایک قرارداد منظور کی، جو حسب ذیل ہے:

۱۔ اردو، دستورِ ہند کی مسلمہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔

۲۔ انتہائی محتاط سرکاری تخمینہ کے مطابق بھی اردو شمالی ہندوستان میں دو کروڑ سے زیادہ باشندوں کی مادری زبان ہے۔

۳۔ اردو کو اس کے اپنے وطن دہلی، اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ میں گزشتہ دس برسوں سے اس کے جائز مقام سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید وہ بدبختانہ سیاسی فضا ہے جو تقسیم ملک کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اردو کو نظم و نسق اور تعلیمی نظام سے باقاعدگی کے ساتھ رفتہ رفتہ ختم کر دیا گیا ہے۔

۴۔ اردو پانچ صدی سے زیادہ کی عظیم اور نمایاں ادبی روایات کی حامل ہے۔

۵۔ اردو کی ان نمایاں خصوصیات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ہندی سے بہت زیادہ قریب ہے، اردو اور ہندی دونوں کا ماخذ اور ماضی مشترک ہے۔

۶۔ یہ بڑی بدبختی ہے کہ ان دو ہمجولی زبانوں میں سے جو ہمارے خیال کے مطابق کھڑی بولی سے پیدا ہوئی ہیں ایک کو اس طرح کچل دینے سے ہندی اور اردو دونوں کے صحت مند خطوط پر نشو و نما کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔

۷۔ ہندستان کے ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس کی یہ پرخلوص خواہش ہے کہ ان دونوں زبانوں کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور ایک دوسرے کی نشو ونما میں مدد دے سکیں۔

۸۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم مندرجہ بالا ریاستوں کی حکومتوں اور حکومت ہند سے سفارش کرتے ہیں کہ:

(الف) ان طلبہ کو جو اردو کو اپنی مادری زبان قرار دیتے ہیں ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم اردو میں حاصل کرنے اور ہندی کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھنے کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں۔

(ب) ان کے تمام محکموں میں اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں۔

(ج) اور اگر کوئی خواہش کرے تو تمام دستاویزوں کی نقلیں اردو میں بھی مہیا کی جائیں۔

۹۔ اگرچہ مذکورہ ریاستوں میں سے بعض نے ان سفارشات کو جزوی یا کلی طور پر قبول کرلیا ہے لیکن نظم ونسق کی سطح پر ان پر عمل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ بعض رکاوٹیں کھڑی کردی گئی ہیں۔

۱۰۔ اس لئے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہماری سفارشوں کو ان

تمام مذکورہ بالا ریاستوں میں یکساں طور پر قبول کیا جائے اور انتظامی مشنری کی طرف سے جو رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے موثر قدم اٹھائے جائیں۔

۱۱۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دینے سے ایک صحت مند فضا پیدا ہو جائے گی اور اردو اور ہندی کے درمیان غیر صحت مند مخالفت ختم ہو جائے گی۔

⦿ ۶۷۔۱۹۶۶ء کی کانفرنس سے متعلق جتنے دستاویز ملتے ہیں ان سب میں اسے چھٹی کل ہند کانفرنس بتایا گیا ہے۔ یکم فروری ۱۹۶۷ء کے ہفتہ وار "ہماری زبان" میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں اس کانفرنس کو چھٹی کل ہند کانفرنس لکھا گیا۔ آگے چل کر اس کانفرنس کی کمیٹی نے ایک سوینیئر شائع کیا جس میں اس کانفرنس کو باقاعدہ چھٹی کل ہند کانفرنس ہی لکھا گیا۔ اس کانفرنس کے بینر پر بھی (جو کہ سوینیر میں دکھائی گئی تصویر میں صاف صاف ظاہر ہوتا ہے) چھٹی کل ہند کانفرنس لکھا گیا ہے۔ سجاد ظہیر نے ۲۱ر جنوری ۱۹۶۷ء کو رام ببراشیم کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس کانفرنس کو چھٹی کانفرنس ہی لکھا (کیونکہ یہ خط جس لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا وہ اس مذکورہ کانفرنس کا ہی ہیڈ تھا) ۵۶

اس کے برعکس مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کے رسالہ 'شاہراہ' میں جو کانفرنس نمبر بھی ہے دہلی میں ۶، ۷، ۸، مارچ کو ہونے والی کانفرنس کو چھٹی کل ہند کانفرنس بتایا گیا ہے اور اس کی پوری روداد شائع کی گئی ہے، خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنی کتاب "اردو میں ترقی پسند تحریک" میں ۱۹۵۳ء کی کانفرنس کو چھٹی کل ہند کانفرنس لکھا ہے۔ خود تحریک کے بانی سجاد ظہیر کی مشہور تخلیق "روشنائی" (جو کہ تحریک اور انجمن کی سب سے دلچسپ تاریخ ہے) کے تناظر میں دیکھا جائے تو پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ ۱۹۳۶ء، دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ ۱۹۳۸ء، تیسری کل ہند کانفرنس دہلی ۱۹۴۲ء، چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی ۱۹۴۳ء (یہاں تک

سجاد ظہیر نے خود روشنائی میں لکھا ہے) کے بعد ۱۹۳۹ء کی بمبئی کی کانفرنس پانچویں ہوگی، ۱۹۵۳ء کی کانفرنس چھٹی ہوگی اور اس لحاظ سے ۶۷-۱۹۶۶ء کی کانفرنس ساتویں کل ہند کانفرنس ہوگی۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ۶۷-۱۹۶۶ء کی کانفرنس کا جو سوونیئر شائع ہوا ہے اس کے صفحہ نمبر ایک پر اس وقت تک ہونے والی کل ہند کانفرنسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں تیسری کل ہند کانفرنس دہلی ۱۹۴۲ء کو حذف کر دیا گیا ہے اور بمبئی ۱۹۴۳ء کی کانفرنس کو تیسری کل ہند کانفرنس لکھا گیا ہے جو کہ دراصل چوتھی کل ہند کانفرنس تھی۔ (خود روشنائی میں سجاد ظہیر نے اسے چوتھی کل ہند کانفرنس لکھا ہے)۔ اب یہ نہیں معلوم کہ تیسری کل ہند کانفرنس ۱۹۴۲ء کا تذکرہ اس سوونیئر میں کیوں نہیں کیا گیا؟ قصداً یا سہواً۔ جب کہ یہ وہی کانفرنس ہے جس کے متعلق سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ہے کہ کرشن چندر کے دعوت نامے اور عبدالعلیم کے دعوت نامے نے مل کر مضحکہ خیز صورت بنا دی تھی اور اس کانفرنس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کے حضرات شریک ہو گئے تھے۔

لہٰذا مذکورہ مباحثہ سے ہماری بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے کہ دہلی کی اس کانفرنس کو جسے چھٹی کل ہند کانفرنس کہا گیا ہے دراصل ساتویں کل ہند کانفرنس تھی۔

maablib.org

گیا کانفرنس

۶تا۹/مئی ۱۹۷۵ء

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے ساتویں کل ہند کانفرنس منعقد کی اور تنظیم و تحریک کو ایک بار پھر سجاد ظہیر کی قیادت میں سونپ دیا گیا۔ سجاد ظہیر انجمن کے جنرل سکریٹری چنے گئے اور انھوں نے تنظیم و تحریک کو سنوارنے کا کام شروع کر دیا۔ امید کی جارہی تھی کہ انجمن میں دوبارہ جان پڑ جائے گی اور سجاد ظہیر کی شخصیت، ان کی ہر دلعزیزی اور تنظیمی صلاحیت اپنا رنگ دکھائے گی۔ مگر یہ محض جذبۂ عقیدت ثابت ہوا۔ اس میں وہ رنگ نہ آسکا جس کی لوگوں کو توقع تھی۔ اس کے قصوروار نہ تو سجاد ظہیر تھے اور نہ ہی اراکین انجمن، بلکہ ذمہ دار تھے اس وقت کے حالات۔ پودا معقول زمین میں ہی پھل پھول سکتا ہے۔ پودے کی نسل اور مالی کی محنت بھی بنجر زمین میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ اب حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے تھے۔ ضرورتیں بدل چکی تھیں، ترجیحات بدل گئے تھے، سماجی، معاشی اور سیاسی تقاضے تبدیل ہو چکے تھے۔ ایسے میں ادب اور ادیب کا بھی متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ ۱۹۶۰ء سے 'جدیدیت' ایک

نئے ادبی رجحان کے طور پر سر اٹھا چکی تھی۔ ایسے میں تحریک کو سیاسی و سماجی محاذ کے علاوہ ادبی محاذ پر بھی زور آزمائی کرنی پڑی۔ ایسے حالات میں انجمن کو اپنی ضرورت اور افادیت ثابت کرنی پڑی۔ دوسری طرف خود سجاد ظہیر سیاست میں زیادہ مصروف ہو گئے جس سے ادبی معاملات میں نسبتاً کم وقت دے پاتے۔ اس کی وجہ بھی بالکل صاف ہے اور اس میں کوئی مغالطہ نہیں کہ آزادیٔ ملک (یا تقسیم ملک) کے بعد ہندستان کے حالات دوسرے ہو چکے تھے اور اب کیمونسٹ پارٹی کو بجائے انگریزوں کے اپنے ہی ملک کی سیاسی پارٹیوں اور حکمرانوں سے نظریاتی اور سیاسی جنگ لڑنی تھی۔ لہٰذا انجمن کی تنظیم دھیرے دھیرے کمزور پڑنے لگی اور تعطل کا شکار ہو گئی۔ حسینی شاہد نے گیا کانفرنس کی رپورٹ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کوئی آٹھ دس سال پہلے اس سلسلہ میں (تنظیمی انتشار اور جمود کو ختم کرنے کے سلسلے میں) ایک کوشش تحریک کے رہنما سجاد ظہیر نے کی تھی لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم ادھر پچھلے چند برسوں میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بعض علاقوں میں قائم ہوئی جن میں بعض انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام اور بعض کسی اور نام سے کام کرنے لگیں۔ لیکن ان کے درمیان کوئی ربط قائم نہ ہو سکا۔ جو تحریک اور تنظیم دونوں کی ترقی اور استحکام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس ضرورت کو بعض ادیبوں اور شاعروں نے محسوس کیا اور آپس میں صلاح مشورے کے بعد ایک ایسا منشوری مسودہ تیار کیا جس کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ ادیبوں کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ اس مسودے کو گشت کروایا گیا۔ بعض ترمیموں کے ساتھ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے اس سے اتفاق کیا۔ مرحمہ مسودے کو پھر ایک بار گشت کروایا گیا جس پر بہت کم مدت میں

پانچ سو سے زائد ادیبوں اور شاعروں نے دستخط کیے اور طے کیا گیا
کہ اس مسودے کو قطعیت دینے اور ایک مرکزی تنظیم کی تشکیل کے
لیے کل ہند اجتماع منعقد کیا جائے۔" 57

بہار پرگتی شیل لیکھک سنگھ نے اس کانفرنس کے انعقاد کی ذمہ داری سنبھالی اور بہار ہی کے شہر گیا میں اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس میں مختلف زبانوں کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا۔ جن کی تعداد سو سے زائد تھی۔ مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر گوپال پرساد مجلس استقبالیہ کے صدر بنائے گئے۔" ہماری زبان" میں شائع ایک رپورٹ میں کہا گیا:

"گیا میں آگ برس رہی تھی لیکن ادیب ٹھنڈے دل کے ساتھ تحریک اور تنظیم کے مسائل پر غور کر رہے تھے۔ مباحث نے طول پکڑا اور کم و بیش ہر ادیب نے اظہار خیال کیا لیکن جو بات دل کو بڑھاوا دیتی تھی وہ یہ تھی کہ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ تحریک اور تنظیم کی بنیادیں وسیع سے وسیع تر ہوں اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ ہر اس ادیب و شاعر کا خیر مقدم کیا جائے جو ہمارے منشور سے اتفاق کرتا ہے تاکہ تمام جمہوریت پسندوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو سکے اور ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ جمہوری قدروں کی حفاظت اور سامراجی اور فسطائیوں کی مقاومت کیا جا سکے اور ایسے ادب کی تخلیق کی رفتار تیز ہو جس کی بنیادیں عوامی زندگی میں پیوست ہوں اور عصری حقیقتوں کی بھرپور ترجمانی اور فرد کے دل کی دھڑکنوں اور قوم کے ضمیر کی آواز کی نمائندگی کر سکے۔ 58

اس کانفرنس میں مختلف زبانوں کے نمائندوں نے مقالے پڑھے اور تقریریں

گئیں۔ خاص کر عصری ادب اور میلان اور رجحانات پر روشنی ڈالی گئی اور نشاندہی کی گئی۔ ایک پورا دن محض اس لئے مخصوص کیا گیا تھا کہ اس دن صرف منشور پر بحث کی جائے۔ اسے ترمیم و تنسیخ کے بعد اس لائق بنا دیا جائے کہ وہ سب کے لئے قابل قبول بھی ہو اور قابل عمل بھی۔ حسینی شاہد کی رپورٹ بتاتی ہے کہ:

> ''مسودۂ منشور پر بحث کے لئے ایک دن مختص تھا۔ اگرچہ مسودۂ منشور پر پہلے ہی بحث و مباحثہ کا آغاز ہو چکا تھا اور کانفرنس میں جو مسودہ پیش ہوا تھا اس میں بہت سی ترمیمات شامل کی جا چکی تھیں، تاہم بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے تھے یا ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور بعض مقامات بہتر اظہار و اسلوب کے متقاضی تھے۔ کانفرنس میں ان تمام کوتاہیوں اور فروگزاشتوں پر سیر حاصل بحث ہوئی اور متعدد ترمیمیں پیش کی گئیں جن کو شامل کرنے کی وجہ سے منظور کردہ منشور نے انتہائی جامع شکل اختیار کر لی۔'' ۵۹

کانفرنس میں کئی قراردادیں بھی منظور ہوئیں۔ جس میں سے ایک اردو کے قانونی تحفظ کے بارے میں بھی تھی جو کہ متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ اس کے علاوہ تنظیمی معاملات پر بحث ہوئی اور آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ اس انجمن کا نام ''نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرس'' ہوگا۔ حسینی شاہد لکھتے ہیں :

> ''تنظیم کے تعلق سے کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا نام ''نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرس'' ہوگا۔ جس سے وہ تمام انجمنیں ملحق ہو سکتی ہیں جو فیڈریشن کے منشور سے متفق ہوں چاہے ان کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین ہو یا کچھ اور۔ ادیب اور شاعر انفرادی طور پر بھی اس سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔'' ۶۰

گیا کانفرنس کا منشور (تلخیص)

(یہ تلخیص حسنین شاہد کی رپورٹ کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ اس کا اصل مسودے کے ربط و تسلسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔)

ترقی پسند ادیبوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سامراجیت، فسطائیت اور رجعت پسندی کے خلاف جہاد کے لئے جمہوری طاقتوں کو متحد کرنا ہوگا۔ نیز عوام کو سرفروشی کے لئے تیار کرنا ہوگا تا کہ جمہوریت، جمہوری اداروں اور ترقی پسند اقدار کے خلاف رجعت پسندوں کی ناپاک سازشیں ناکام ہوں اور ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے پورے پورے مواقع حاصل ہوں۔

عالمی طاقتوں کے سیاسی توازن میں نمایاں اور اثباتی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور سوشلسٹ طاقتوں کا پلہ بھاری ہو گیا ہے۔ ویتنام اور کمبوڈیا نے سامراج کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں اور اسے ایسا دھکا دیا ہے کہ وہ کبھی سنبھل نہیں سکتا۔ ان فتوحات نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا ہے۔ پرتگالیوں نے فسطائیت کو نیچا دکھا کر ایک نئے جمہوری دور کا آغاز کیا ہے۔ عربوں میں یہ احساس آئے دن شدید ہوتا جا رہا ہے کہ ان کے قومی وسائل پر غاصبانہ قبضہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی دھرتی، اپنے وسائل اور اپنی قومی دولت کے آپ مالک ہیں۔ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا کے عوام بیدار ہو چکے ہیں اور ان کی جدوجہد نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا

ہے۔ اس صورت حال نے سامراجیوں کی کمر توڑ دی ہے اور سوشلسٹ طاقتیں سربلند اور سرافروز ہوتی جا رہی ہیں۔

لیکن ہمارے ملک میں پے در پے شکستوں کے باوجود سامراجی ریشہ دوانیاں ختم یا کمزور ہونے نہیں پائی ہیں۔ رجعت پسندوں، فرقہ پرستوں اور بڑے سرمایہ داروں کے ساتھ سامراج کا گٹھ جوڑ نت نئے فتنوں کو جنم دے رہا ہے۔ سامراج کے مقامی ایجنٹ، عوام، جمہوریت اور جمہوری اداروں کے خلاف گھناؤنی سازشوں میں مصروف ہیں اور عوام کو ان سہولتوں اور حقوق تک سے محروم کرنے کی فکر میں ہیں جن کی حقیقت کچھ زیادہ نہیں لیکن جن کو انھوں نے اپنا خون دے کر حاصل کیا ہے۔ ملک بھر میں ابھرتی ہوئی فسطائیت ابھی کمزور سہی لیکن ہم کو چلی سے سبق لینا چاہیے۔

اہل قلم کو چاہیے کہ وہ اپنے قلم سے ان طاقتوں کو بڑھاوا دیں جو امن، خوش حالی، سماجی ترقی، جمہوریت کی بقا اور اس کے تحفظ کی تائید میں اور سامراج اور ان کے پچھوں کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

ادب اور عوام کے درمیان اٹوٹ رشتہ ہے۔ اسی لئے ہمارے ادب کو اس جدو جہد کا ترجمان ہی نہیں ہونا چاہیے جو ہمارے عوام بھوک، افلاس، استحصال، جمہوریت کے تحفظ اور سوشلسٹ ملکوں سے دوستی کو مستحکم بنانے کے لئے کر رہے ہیں بلکہ ہمیں اس جدوجہد میں مثبت اور صریحی رول بھی ادا کرنا چاہیے۔

ترقی پسند ادیب فرقہ پرستی، مقامیت اور انسان اور اس کی جدوجہد کے تعلق سے منفی رویہ کے خلاف ہیں۔ وہ قنوطیت، تاریک

اندیشی، بے یقینی، بے بسی، شکست خوردگی اور محرومی کے ادب کو رد کرتے ہیں اس لئے کہ انھیں انسان اور اس کی بے پناہ صلاحیتوں اور شاندار اور روشن مستقبل پر پورا اعتماد ہے۔ اس اعتماد سے ادب میں توانائی، حسن، دلکشی اور جان پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہیئت، اظہار اور اسلوب کے خلاف نہیں بلکہ ان کا تخلیقی ذہن نئی ہیئتوں، نئے اسلوب اور نئے اظہار کی تلاش میں رہتا ہے۔ ترقی پسند ادیب قبرستان کے ادب کے نہیں، زندہ و بیدار ادب کے پرستار ہیں۔ وہ صرف اپنے شاندار ادبی ورثے کے مالک ہی نہیں ساری انسانیت کی تہذیبی اور ادبی روایتوں کے بھی وارث ہیں۔ وہ روایت پرست نہیں مگر روایت کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب بہترین روایات کو اپناتے اور بہترین روایات کو جنم دیتے ہیں۔

maablib.org

دہلی کانفرنس

۱۸،۱۷/اپریل ۱۹۷۶ء

انجمن ترقی پسند مصنفین کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر ۱۷/اور ۱۸/اپریل ۱۹۷۶ء کو دہلی میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، کیفی اعظمی، قرۃ العین حیدر، اوپیندر ناتھ اشک، کوثر چاند پوری، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر سید محمد عقیل، قاضی عبدالستار، عمیق حنفی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، شارب ردولوی، اقبال مسعود، غلام جیلانی، علی احمد فاطمی، ڈاکٹر خلیق انجم، حسن نعیم، رفعت سروش، راشد آزر، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر افتخار ظفر، ڈاکٹر سلامت اللہ، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، اظہار اثر، ڈاکٹر عنوان چشتی، سید جمال الدین، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر قمر رئیس، احمد جمال پاشا، شمس الحق عثمانی وغیرہ شامل ہوئے۔ کانفرنس کا پہلا اجلاس غالب اکیڈمی میں ساڑھے دس بجے صبح ہوا۔ مجلس صدارت میں عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر سید محمد عقیل تھے۔ مجلس استقبالیہ کے صدر آنند نرائن ملا اور غلام ربانی تاباں (جنرل سکریٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین) بھی اسٹیج

پر تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے جنرل سیکریٹری کی رپورٹ پیش کی جس میں گزشتہ چالیس سال کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کے بعد علی سردار جعفری نے تنظیم کے مسائل پر اپنی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ ابتدا ہی سے اس تحریک اور تنظیم میں مختلف سیاسی اور سماجی نظریات رکھنے والے ادیب شامل رہے ہیں۔ اس کے اولین معماروں میں اگر ایک طرف پریم چند تھے جو بنیادی طور پر گاندھی وادی اور قوم پرست تھے تو دوسری طرف سید سجاد ظہیر تھے جو کھلے ہوئے اشتراکی تھے۔ ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی علی گڑھ شاخ گزشتہ بیس سال سے سرگرم ہے لیکن رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کے اراکین کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ آنند نرائن ملا نے کہا کہ میرے نزدیک اپنے عہد کے قدروں کی ترجمانی کرنے والے ارتقاء یافتہ ادب کا نام ترقی پسند ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں سیاسی قدروں کے مقابلہ میں انسانی قدروں کی اہمیت زیادہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے کہا کہ تنگ نظری اور رویہ کی طرف واپسی مناسب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو ادب میں واضح طور پر دو دھارے ہیں۔ ایک ترقی پسند طرز فکر کا دھارا اور دوسرا بیمار ذہنیت کا دھارا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ آج ترقی پسندوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ ان کا نیا مینی فیسٹو کیا ہو؟ رپورٹ میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو کانگریس بھی کہتی ہے۔ انھوں نے آنند نرائن ملا کے خیالات کی حمایت کی۔ ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی نے انجمن میں شامل ہونے والے ادیبوں کے معیار کا سوال اٹھایا۔ سید محمد عقیل نے کہا کہ آج کے ادبی اور اجتماعی حالات تیس چالیس سال قبل کے حالات سے بہت مختلف ہیں۔ نئی پود کے ادیب دوسرے ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں۔ آج ہمارا مینی فیسٹو ہماری زندگی ہے۔ ترقی پسندی یہی ہے کہ ہم زندگی کو آگے بڑھانے والی قوتوں کا ساتھ دیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ اس اجتماع میں نوجوان ادیبوں کی تعداد کم ہے۔ کچھ یہی شکوے علی احمد فاطمی نے بھی کیے۔

۷ اپریل کی شام پانچ بجے کے سیمینار میں پنڈت آنند نرائن ملا نے بطور مجلس استقبالیہ کے صدر، حاضرین کو خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں ترقی پسندی ذہن وفکر کی ترقی سے عبارت ہے۔ ہم لوگ جو منتشر ہو گئے تھے اب وقت آگیا ہے کہ پھر ایک کارواں کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان چند برسوں کی خاموشی سے ہماری تحریک کو اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا اندیشہ تھا۔ آج اردو میں ایک نیا ادبی گروہ سامنے آرہا ہے جس کو میں گمراہ کہوں گا۔ جو فکر وشعور کا ابلاغ تو بڑی بات بچوں کی طرح غوں غاں بھی نہیں کر پایا، جسے زبان وبیان پر قابو نہیں، جو الجھی ہوئی موہوم اور مبہم باتیں کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسندوں کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اجتماعی دور کو انفرادی دور پر ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد ہندی کے مشہور ادیب وناول نگار بھیشم ساہنی نے جلسہ کو مخاطب کیا۔
سیمینار کے اس جلسہ کا موضوع ترقی پسند تنقید کے چالیس سال تھا۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قاضی عبدالستار اور ڈاکٹر شارب ردولوی نے مقالے پیش کیے۔ محمد حسن نے کہا منشی پریم چند کا خطبہ آج بھی ادیبوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم سیمیناروں میں بہت اونچی اونچی فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں، مزدوروں اور کسانوں کا بھی ذکر ہوتا آیا ہے لیکن سماج کا بڑا طبقہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نظریات اور ادب عوام تک کیسے پہنچے۔ رفعت سروش نے کہا کہ ترقی پسند نقاد فنکاروں کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ سردار جعفری نے قرۃ العین حیدر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ادب کو عوام تک لے جانا ہے تو اس کی سطح دوسری ہوگی۔ اس میں رمزی اور علامتی اظہار کا رنگ گہرا نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسندوں نے ایسی شاعری کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ عوام کی زبان میں ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ ہر تخلیقی تجربہ اپنی زبان آپ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ عوامی زندگی کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں برتے اور پیش کرے۔ قمر رئیس کا خیال تھا کہ ترقی پسند نظریہ حیات اور ادب کو محنت کش عوام تک لے جانے کی بحث دلچسپ ہے۔ اس کی اپنی

حیثیت ہے لیکن شاید ڈاکٹر محمد حسن کا مدعا یہ نہیں تھا۔ قراۃ العین حیدر اور بعض دوسرے حضرات نے جو اس پر زور دیا ہے کہ ہم اپنے خیالات کو محنت کش عوام تک پہنچائیں تو اس کے پیچھے ایسا لگتا ہے کہ ہماری متوسط طبقہ کی ذہنیت اور رعونت کارفرما ہے۔ آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے کہا کہ یہ سوچنا کہ عوام صرف راست شاعری ہی سمجھ سکتے ہیں، رمزیہ اور علامتی شاعری نہیں، غلط ہے۔ ان کی شاعری ان کا ادب علامتوں اور اساطیر سے بھرا پڑا ہے۔

اس کانفرنس کے دوسرے دن کا پہلا اجلاس صبح دس بجے شروع ہوا۔ جس میں تنظیمی امور پر بحث ہوئی عہدیداران کا انتخاب ہوا اور تجاویز پیش کی گئیں۔ اس میں سے ایک تجویز سامراجی طاقتوں کے خلاف تھی۔ جس میں فلسطینی مجاہدین، چلی کے عوام اور روڈیشیا و جنوبی افریقہ کی عوامی جدوجہد کی حمایت کی گئی۔ سردار جعفری نے کہا کہ آنند نرائن ملا نے سوشلسٹ اسٹیٹ کے قیام کی تشدد کی مذمت کی تھی مگر دیکھنا یہ ہوگا کہ تشدد کا استعمال کب اور کیسے ہوتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں روس کی انقلابی پارٹی جو انقلاب لائی تو ایک امریکی صحافی کے قول کے مطابق وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ ایک دوسری تجویز میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ جہاں پر اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے وہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دہلی سے ایک ماہنامہ شائع کیا جائے جو ترقی پسند تحریک کا ترجمان ہو۔ ایک تجویز میں اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیبوں کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کیا گیا۔ اسی اجلاس میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا، جو حسب ذیل ہے:

صدر	:	علی سردار جعفری
جنرل سکریٹری	:	ڈاکٹر قمر رئیس
مجلس صدارت	:	کرشن چندر، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، کیفی، ڈاکٹر محمد حسن، غلام ربانی تاباں
سکریٹری	:	ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، اختر سعید، ڈاکٹر اجمل اجملی،

ڈاکٹر فصیح ظفر، راشد آزر

خازن : ڈاکٹر سلامت اللہ

اس سیمینار کے دوپہر کے اجلاس کا موضوع تھا' ترقی پسند شاعری کے چالیس سال' اس اجلاس میں ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی نے غزل پر اور عمیق حنفی نے نظم پر مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر وحید اختر اپنی علالت کی وجہ سے جلسہ میں شریک نہ ہو سکے۔

عمیق حنفی نے کہا کہ :

"بیانیہ شاعری بڑی شاعری ہو سکتی ہے اور اس کا نقطۂ کمال اقبال کی شاعری ہے۔ ترقی پسندوں کے یہاں نظم کی فکری سطح اور تعمیری شعور اقبال کے مقابلہ میں پست رہا۔ جوش کی شاعری لفاظی اور دریدہ دہنی کے سوا کچھ نہیں۔ علی سردار جعفری کی بعض نظموں میں خطابت کے باوجود فکری صلابت کا احساس ملتا ہے۔ سردار جعفری نے جوش کے بجائے اقبال سے زیادہ فیض اٹھایا ہے۔" [91]

صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ تحریک کے ابتدائی دور میں غزل کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غزل مزاجاً ریزہ خیالی اور رمزیہ اظہار بیان کا فن ہے۔ سماجی فکر کے واضح اظہار کے لئے غزل کے مقابلہ میں نظم کو زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ بعد میں فیض اور غلام ربانی تاباں نے غزل کے امکانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ

"اردو شعراء کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقہ سے رہا ہے، اس کی شاعری کا مواد اور موضوع بھی متوسط طبقہ کا ہے۔ تیلگو، مراٹھی، بنگالی کی طرح اس کا اپنا لوک ادب نہیں ہے، جس سے زبان قوت مواد اور ذخیرۂ الفاظ حاصل کرتی ہے، اس لئے اردو اس سے

محروم رہی۔ پھر اس میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ کی زندگی سے جو کچھ اخذ کیا اس پر اسے فخر ہونا چاہئے۔ اس کا آغاز حالی سے ہوا۔ اس طبقہ کے جو سیاسی اور سماجی حوصلے تھے وہ راست انداز سے شاعری کا موضوع بنے۔ غزل میں نئی جان حسرت نے پھونکی، آج سرمایہ دارانہ نظام ٹوٹ رہا ہے ہمارا نوجوان سرمایہ داری کے ٹوٹے ہوئے آئینہ کے سامنے کھڑا ہے۔ اس میں اسے اپنا مسخ شدہ عکس نظر آتا ہے۔ اس کا حال دھندلا ہے اور مستقبل بھی صاف نہیں۔ اسے صاف اور واضح کرنا ترقی پسند ادیبوں کا کام ہے۔'' ۶۲

اظہار اثر نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ غزل بیانیہ طرز اظہار کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن فیض اور مجروح نے ثابت کر دیا کہ غزل کا کینوس چھوٹا ہونے کے باوجود اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں ہر طرح کے تجربات موثر ڈھنگ سے بیان ہو سکتے ہیں۔ کوثر چاند پوری، عمیق حنفی کے مقالے سے مایوس نظر آئے، ان کی نگاہ میں اس عہد کی شاعری پر جامع اور منصفانہ باتیں نہیں ہو سکی تھیں۔

اختر سعید خاں نے کہا کہ عمیق حنفی نے جوش پر دریدہ دہنی کا الزام لگایا ہے لیکن میرے خیال میں یہی بات ان کے مضمون کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان کا جائزہ ایک طرفہ اور ادھورا ہے انھوں نے اپنے موضوع اور مقالے سے انصاف نہیں کیا۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ:

''یہ عجیب بات ہے کہ جب ترقی پسند شاعری کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تحریک کی نسبتاً کمزور شاعری کو سامنے رکھ کر فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ ہر شاعری کی طرح ترقی پسند شاعروں کی اچھی اور کمزور دونوں طرح کی شاعری ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ جائزہ لیتے ہوئے پوری شاعری کو نظر میں رکھا جائے، آج مایوسی، بیزاری

اور بے یقینی کی شاعری پر اعتراض کیا جاتا ہے تو جدید نقاد کہتے ہیں کہ آج کے حالات میں جب اقدار اپنا بھرم کھو چکی ہیں، جب ہر چیز سے یقین اٹھ چکا ہے تو اسی طرح کی ہی شاعری کی جا سکتی ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ترقی پسند ادب ہر دور میں پیدا ہوا ہے۔ ہم صرف چالیس سال کے ادب کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یہ سالگرہ ہماری انجمن کی چالیسویں سالگرہ ہے، ترقی پسند ادب کی نہیں۔“ ۹۳؎

ڈاکٹر عنوان چشتی نے ترقی پسند شاعری کے بڑے حصے کو راست بیانیہ اور ہنگامی واقعات کی شاعری قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ فیض کی شاعری اس لئے اپیل کرتی ہے کہ وہ رمزیہ پیرائے کی شاعری ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک ہیئت کے تجربوں کا تعلق ہے جدیدیوں کو اس میدان میں ترقی پسندوں پر فوقیت حاصل ہے۔ رفعت سروش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی فکر کی شاعری کو ترقی پسندوں نے آگے بڑھایا ہے۔ جعفری کی شاعری بڑی فکر کی شاعری ہے۔ سردار جعفری، سلام مچھلی شہری اور دوسرے شعراء نے کامیاب طویل نظمیں لکھی ہیں۔ اسی سلسلہ میں سید جمال الدین نے کہا کہ ترقی پسند شعراء بالخصوص فیض اور سردار جعفری کے یہاں جہاں فکر احساس میں ڈھل گئی ہے اور نظریہ بن گیا ہے وہاں بلند اور بڑی شاعری وجود میں آئی ہے ہندی کے شاعر شمشیر بہادر نے کہا کہ آج نئی اور پرانی پیڑھی کا تصادم ہے۔

سیمینار کا آخری اجلاس اسی دن شام کو شروع ہوا۔ اس کا موضوع ’ترقی پسند نثری ادب کے چالیس سال تھا‘۔ مجلس صدارت میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، پروفیسر محمد حسن، غلام ربانی تاباں اور قاضی عبدالستار تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے ’ترقی پسند تحریک اور افسانہ‘ پر، سید ضمیر حسن نے ’ترقی پسند تحریک اور ڈرامہ‘ اور احمد جمال پاشا نے ’ترقی پسند تحریک اور طنز و مزاح‘ پر اور ڈاکٹر قمر رئیس نے ’ترقی پسند تحریک اور ناول‘ پر

مقالے پڑھے۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے اوپیندر ناتھ اشک نے کہا کہ مقالے بھرپور اور جامع نہیں ہیں۔ امتیاز علی تاج اور منٹو کا ذکر زیادہ مناسب طریقے سے ہونا چاہئے تھا۔ بلراج مین را نے کہا کہ میں احتجاجاً اس بحث میں حصہ نہیں لے رہا ہوں کیونکہ کہا جا رہا ہے کہ مشاعرہ کی خاطر کچھ دیر بعد یہ اجلاس ختم ہو جائے گا، گویا مشاعرہ اس بحث سے زیادہ اہم ہے۔ قاضی عبدالستار نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک مشاعرے، مجرے اور قوالی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سید جمال الدین، شمس الحق عثمانی اور رتن سنگھ وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ اور اس طرح یہ کانفرنس چالیس سال کے اپنے تجزیہ اور اپنی خوبیوں اور خرابیوں پر نکتہ چینی کے بعد ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے اور بہتر ادب دینے کے وعدے کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

گولڈن جوبلی کانفرنس، لندن

(۳،۴ راگست ۱۹۸۵ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سنگ بنیاد ۱۹۳۵ء میں لندن میں پڑی تھی مگر جب اس انجمن کے سبھی اراکین اور عہدے دار دھیرے دھیرے ہندستان واپس آ گئے اور یہیں پر اس انجمن کی دوبارہ تشکیل ہوئی تو لندن کی انجمن بے سروساماں ہو گئی اور مدت دراز تک تعطل و گمنامی کی شکار رہی۔ لندن میں سکونت پزیر بہت سے ترقی پسند ادیب اور شاعر چاہتے تھے کہ لندن میں ایک بار پھر سے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم اور فعال ہو ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۸۳ء میں فیض احمد فیض کی ہمت افزائی اور پہل سے لندن میں ترقی پسند مصنفین (برطانیہ) کی تشکیل ہوئی اور فارغ بخاری (پاکستان کے مشہور ترقی پسند شاعر) صدر اور عاشور کاظمی جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔ یہ انجمن پورے جوش و خروش کے ساتھ کام کرنے لگی۔ ۱۹۸۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے پچاس سال پورے ہو رہے تھے۔ ایسے میں عاشور کاظمی نے منصوبہ بنایا کہ کیوں نہ گولڈن جبلی کانفرنس کر لی جائے۔ لندن میں اس کانفرنس کے ہونے سے اس کی معنویت اور تاریخیت میں اضافہ ہو جانا لازمی

تھا۔ ۱۵؍ جولائی ۱۹۸۳ء کو اس انجمن نے سجاد ظہیر کی یاد میں ایک پروگرام کیا اور ڈاکٹر قمر رئیس کی حوصلہ افزا تائید کے بعد اسی دن گولڈن جبلی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ اس مہم میں عاشور کاظمی اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے پس پشت فارغ بخاری، بخش لائل پوری اور جاوید حکیم قریشی کی زبردست حمایت اور معاونت تھی۔

عاشور کاظمی نے اس کانفرنس کے رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

"۱۵ جولائی ۱۹۸۳ء کا دن لندن کانفرنس کے حوالے سے ایک یادگار دن ہے۔ اس تاریخ کو ہم نے بیاد سجاد ظہیر ایک شام منائی تھی۔ جس میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر شبیہ الحسن، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے محمد حسن، پاکستان کے ڈاکٹر ایوب مرزا، اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر قمر رئیس نے شرکت کی۔ اس دن میں صبح صبح ڈاکٹر رئیس سے ملنے گیا تو میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ "قمر رئیس صاحب اگر ہم لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی منائیں تو آپ ہماری کیا مدد کریں گے؟" ڈاکٹر قمر رئیس صوفے پر دراز تھے، میرے سوال پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "بھئی واللہ ہمارے ذمہ جو خدمت ہوگی ہم اسے پورا کریں گے۔" ...... قمر رئیس صاحب میری ایک بات سے متفق تھے کہ برصغیر میں یہ تحریک تنظیمی بحران کا شکار ہے۔ قمر رئیس صاحب بار بار اسی بات پر اصرار کر رہے تھے کہ لندن میں گولڈن جوبلی کا انعقاد اس تحریک میں ایک نئی روح پھونک دینے کا موجب ہو سکتا ہے ...... اور پھر جب میں نے فارغ بخاری، بخش لائل پوری، جاوید حکیم قریشی اور رفقاء سے اس کا ذکر کیا تو سب نے یہی کہا کہ اسی شام کی تقریب میں اس کا اعلان کر دیا جائے ...... اور

اسی شام لندن میں گولڈن جوبلی کے انعقاد کا اعلان ہو گیا۔" ۶۴

پروفیسر علی احمد فاطمی کی کتاب 'سفر ہے شرط' جو کہ لندن کا سفرنامہ بھی ہے اور گولڈن جوبلی کانفرنس کی رپورتاژ بھی، ایک مستند دستاویز ہے جس میں انھوں نے جوبلی کانفرنس کی دلچسپ انداز میں بھرپور تصویر پیش کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں :

> "۳ راگست ۱۹۸۵ کی لندن کی صبح ہمارے لئے ایک تاریخی صبح تھی کہ آج ہم پھر اسی روایت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے جا رہے تھے کہ جس کو آج سے پچاس سال قبل ہندستانی ادیبوں نے جنم دیا تھا۔ ایک ایسی زبردست روایت کہ جس نے آگے چل کر ایک مکمل اور مستحکم تحریک کا روپ لے لیا اور ہندستان کی ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی میں تاریخی و انقلابی رول ادا کیا۔ پھر تو اس تحریک کے ماننے جاننے والوں کا ایک قافلہ تیار ہوا اور پورے پچاس سال کے بعد اسی سرزمین پر تحریک کے متوالے دور دور سے ایک بار پھر یکجا ہوئے ہیں۔ ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے لئے۔ سجاد ظہیر کی ٹیم تو صرف پانچ سات کی تھی اب یہ ٹیم قطرے سے سمندر میں بدل چکی ہے اور اس کے اصولوں اور نظریوں کی گونج آسمان کی وسعتوں میں سما چکی ہے۔" ۶۵

یہ گولڈن جوبلی کانفرنس لندن کے مشہور تہذیبی و ثقافتی عمارت گریٹر لندن کونسل (G.L.C.) کے ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ ہال لندن میں کسی کامیاب جلسے یا کانفرنس کی ضمانت مانا جاتا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس پچاس سالہ جشن کے لئے اس کونسل نے نہ صرف اپنا خوبصورت ہال دیا بلکہ مالی تعاون اور ایک وقت کا تمام مندوبین کا استقبالیہ بھی دیا۔ ۳ راگست کو صبح ۱۰ بجے ہال میں مندوبین آنے شروع ہو گئے۔ جس میں لندن کے علاوہ روس، پاکستان اور ہندستان کے مشہور و معروف ادیب و شاعر و دانشور شامل تھے۔

تھا۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء کو اس انجمن نے سجاد ظہیر کی یاد میں ایک پروگرام کیا اور ڈاکٹر قمر رئیس کی حوصلہ افزا تائید کے بعد اسی دن گولڈن جبلی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ اس مہم میں عاشور کاظمی اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے پس پشت فارغ بخاری، بخش لائل پوری اور جاوید حکیم قریشی کی زبردست حمایت اور معاونت تھی۔

عاشور کاظمی نے اس کانفرنس کے رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

"۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء کا دن لندن کانفرنس کے حوالے سے ایک یادگار دن ہے۔ اس تاریخ کو ہم نے بیاد سجاد ظہیر ایک شام منائی تھی۔ جس میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر شبیہ الحسن، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے محمد حسن، پاکستان کے ڈاکٹر ایوب مرزا، اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر قمر رئیس نے شرکت کی۔ اس دن میں صبح صبح ڈاکٹر رئیس سے ملنے گیا تو میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ "قمر رئیس صاحب اگر ہم لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی منائیں تو آپ ہماری کیا مدد کریں گے؟" ڈاکٹر قمر رئیس صوفے پر دراز تھے، میرے سوال پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "بھئی واللہ ہمارے ذمہ جو خدمت ہوگی ہم اسے پورا کریں گے۔" ...... قمر رئیس صاحب میری ایک بات سے متفق تھے کہ برصغیر میں یہ تحریک تنظیمی بحران کا شکار ہے۔ قمر رئیس صاحب بار بار اسی بات پر اصرار کر رہے تھے کہ لندن میں گولڈن جوبلی کا انعقاد اس تحریک میں ایک نئی روح پھونک دینے کا موجب ہو سکتا ہے...... اور پھر جب میں نے فارغ بخاری، بخش لائل پوری، جاوید حکیم قریشی اور رفقاء سے اس کا ذکر کیا تو سب نے یہی کہا کہ اسی شام کی تقریب میں اس کا اعلان کر دیا جائے...... اور

اسی شام لندن میں گولڈن جوبلی کے انعقاد کا اعلان ہو گیا۔" ۶۴

پروفیسر علی احمد فاطمی کی کتاب 'سفر بے شرط' جو کہ لندن کا سفرنامہ بھی ہے اور گولڈن جوبلی کانفرنس کی رپورتاژ بھی، ایک مستند دستاویز ہے۔ جس میں انھوں نے جوبلی کانفرنس کی دلچسپ انداز میں بھرپور تصویر پیش کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"۳ر اگست ۱۹۸۵ کی لندن کی صبح ہمارے لئے ایک تاریخی صبح تھی کہ آج ہم پھر اسی روایت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے جا رہے تھے کہ جس کو آج سے پچاس سال قبل ہندستانی ادیبوں نے جنم دیا تھا۔ ایک ایسی زبردست روایت کہ جس نے آگے چل کر ایک مکمل اور مستحکم تحریک کا روپ لے لیا اور ہندستان کی ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی میں تاریخی و انقلابی رول ادا کیا۔ پھر تو اس تحریک کے ماننے جاننے والوں کا ایک قافلہ تیار ہوا اور پورے پچاس سال کے بعد اسی سرزمین پر تحریک کے متوالے دور دور سے ایک بار پھر یکجا ہوئے ہیں۔ ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے لئے۔ سجاد ظہیر کی ٹیم تو صرف پانچ سات کی تھی اب یہ ٹیم قطرے سے سمندر میں بدل چکی ہے اور اس کے اصولوں اور نظریوں کی گونج آسمان کی وسعتوں میں سما چکی ہے۔" ۶۵

یہ گولڈن جوبلی کانفرنس لندن کے مشہور تہذیبی و ثقافتی عمارت گریٹر لندن کونسل (G.L.C.) کے ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ ہال لندن میں کسی کامیاب جلسے یا کانفرنس کی ضمانت مانا جاتا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس پچاس سالہ جشن کے لئے اس کونسل نے نہ صرف اپنا خوبصورت ہال دیا بلکہ مالی تعاون اور ایک وقت کا تمام مندوبین کا استقبالیہ بھی دیا۔ ۳ر اگست کو صبح ۱۰ بجے ہال میں مندوبین آنے شروع ہو گئے۔ جس میں لندن کے علاوہ روس، پاکستان اور ہندستان کے مشہور و معروف ادیب و شاعر و دانشور شامل تھے۔

ہیں اور کچھ بڑے کام ضرور انجام دیں گے۔ میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔'' ۶۷

رالف رسل کے بعد ایلس فیض نے جلسے کو مخاطب کیا اور اس کے بعد پہلے اجلاس کا اختتام ہو گیا۔

دوسرا اجلاس تقریباً ایک بجے شروع ہوا۔ اس کی صدارتی ٹیم میں صفدر میر، اے سکا چوف، عبداللہ ملک، پروفیسر سید محمد عقیل اور نسیم بھابیہ شامل تھے۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے علی سردار جعفری نے تقریر کی اور کہا:

''گزشتہ دنوں بار بار یہ اعلان سننے کو ملا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ ہمیشہ یہی کہا گیا۔ آج کا یہ بھرپور اجتماع اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ آج کا یہ اجتماع دیکھ کر مجھے اپنی جوانی کے ایسے نہ جانے کتنے جلسے یاد آ رہے ہیں جو ہم نے کیے تھے.... ہمارے اوپر یہ الزام ہے کہ ہم نے تحریک کے ذریعہ اقبالؔ نہیں پیدا کیا۔ لیکن اس کے بعد وسعت ضرور پیدا کی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اس بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر یہ سوچتا ہے کہ ہمارا قد باپ سے زیادہ ہے۔ ہم نے اپنی روشنی کو چہار سمتوں میں پھیلایا ہے۔ روی شنکر، ایم. ایف. حسین، یہ سب کے سب تحریک سے متاثر ہوئے ہیں۔ اپٹا وجود میں آیا۔ فلموں پر اثر ڈالا۔ نئی بیداری پیدا کرنے میں ہماری تحریک نے بڑا کام کیا ہے۔ ہر دور میں تحریک پر خطرات بھی رہے آج سب سے بڑا خطرہ نیوکلیر جنگ کا ہے۔ نفرت، فرقہ وارانہ فسادات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش یہ سارے ملک جو ہمیشہ امن کی گارنٹی رہے ہیں ان کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی لڑائی اسی سے ہے۔ اپنے ادب کو

اس چیلنج کے ساتھ پیش کریں اور سب سے بڑھ کر ڈرامے کے بنیادی اصول کو بدلیں کیونکہ ڈرامہ تبدیلی میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔

میں ملک راج آنند کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ اب ہماری تحریک کو جدید تر وسعت دینی چاہئے۔ اس میں افریقہ، ایشیا کو ہی نہیں بلکہ امریکہ کو بھی اپنے ساتھ لیں تا کہ امن عالم اور آزادی کے لئے ادب اور فن کی سربلندی کے لئے، وقار کے لئے ہم اپنی جنگ کو جاری رکھ سکیں۔ آیئے آج کی اس محفل میں ہم یہ عہد کریں۔" ۶۸

جعفری کی اس تقریر کے بعد جلسے کا باضابطہ آغاز ہوا۔ سب سے پہلے پٹنہ کے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد بلائے گئے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید" اس میں انھوں نے احمد علی سے لے کر قمر رئیس تک کا تنقیدی سفر پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر لطف الرحمن نے اپنا مقالہ "ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری" کے عنوان سے پیش کیا۔ پھر ڈاکٹر فضل امام صاحب نے "ترقی پسند تحریک اور اردو ادب" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر فضل امام کے بعد چنڈی گڑھ کے ڈاکٹر نریش نے بجائے مقالہ کے ایک مختصر تقریر کی اور اس کے بعد پروفیسر وہاب اشرفی نے "ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ان کے بعد پاکستان کے شاعر رضا ہمدانی اور صحافی و افسانہ نگار حمید اختر نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس میں سردار جعفری کی تقریر کے علاوہ کل سات مقالے پیش کیے گئے تھے اور چونکہ وقت کم تھا اس لئے صدارتی ٹیم نے کوئی تقریر نہیں کی اور نہ ہی سوال و جواب ہوئے۔ وقت کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ منتظمین نے دس منٹ کی پابندی کا اعلان کر دیا جس کے سبب دو ایک نے مقالے نہ پیش کر کے تقریر کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ پروفیسر فاطمی نے اپنے رپورتاژ میں دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ:

"اس کے بعد جے پور کے ڈاکٹر فضل امام کو زحمت دی گئی۔ فضل امام بھاری بھرکم شخصیت۔ اسی طرح ان کی آواز اور اسی

طرح ان کے مقالے کا عنوان "ترقی پسند تحریک اور اردو ادب"۔ صرف سوچئے کہ صرف دس منٹ اور یہ پھیلا ہوا موضوع۔ چنانچہ آتے ہی وہ طوفان میل کی طرح شروع ہو گئے۔ موٹی لیکن بندھی ہوئی آواز۔ کچھ پرانی باتیں کچھ نئے احساسات۔ صرف دو جملے میں سمجھ سکا جو حسب ذیل ہیں۔ "غم جاناں اور غم دوراں کا تصور اسی تحریک نے دیا" "تحریک نے اظہار کی قوت عطا کی اور ان موضوعات کو چنا جو کبھی سوچے نہ جا سکتے تھے۔" تعریف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی تیز رفتاری سے اپنا مقالہ واقعی دس منٹ میں ختم کر لیا اور اس کے بعد چنڈی گڑھ کے ڈاکٹر نریش آئے۔ شیروانی میں بند تیکھا مزاج۔ چنانچہ آتے ہی انھوں نے کہا "میں پرچہ نہیں پڑھوں گا، کیونکہ پرچوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ بھی ہو۔" 39

اس کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی صدارتی ٹیم میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر ساجدی زیدہ، اشفاق حسین (کینیڈا) اور فارغ بخاری تھے۔ یہ اجلاس سجاد ظہیر اور فیض سے متعلق تھا۔ پہلی مقالہ نگار پاکستانی شاعرہ سعیدہ گزدر تھیں جن کا مقالہ اتفاق سے سجاد ظہیر یا فیض کے بجائے ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت اور فن پر تھا پھر بھی سنا گیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں رشید جہاں کے پیشے اور ان کے افسانوں کا ملا جلا تجزیہ پیش کیا تھا۔ پروفیسر فاطمی نے لکھا ہے کہ انھوں نے کہا:

> "میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، لیکن ان کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے ان کی پرستش کرنا چاہتی ہوں...... ٹھیک دس منٹ بعد پروفیسر محمد حسن نے اپنی صدارتی اختیارات استعمال کئے اور انھیں ٹوکا۔ وہ لڑکھڑائیں۔ وہ سنانا چاہتی تھیں اور شاید لوگ سننا چاہتے تھے

لیکن مجبوری تھی۔ مقالہ پورا ختم نہیں ہو پایا اور وہ خفیف سی ناگواری
کے ساتھ واپس چلی آئیں۔ پاس بیٹھی ہوئی کچھ عورتوں میں
سرگوشیاں شروع ہوئیں لیکن محمد حسن جیسا سخت صدر دیکھ کر وہ چپ ہو
گئیں، بنیادی طور پر وہ عورتیں کمزور تھیں۔ بس ایک ہلکا سا اثر ڈاکٹر
رشید جہاں کی زندگی سننے کے بعد پیدا ہوا تھا، پھر فطری انداز میں
دب گیا۔" •

سعیدہ گزدر کے بعد نسیم بھابیہ نے اپنے والد کی یاد میں تقریر کی۔ اس کے بعد بھوپال کی ڈاکٹر شفیقہ فرحت نے فیض سے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے کو انھوں نے بھوپال کے گیس حادثے سے جوڑا۔ شفیقہ فرحت کے بعد لندن کی اردو کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ نے فیض پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس جلسے کا پانچواں مقالہ فیض پر ہی تھا اور اسے اشفاق حسین نے پیش کیا۔ اشفاق حسین کے بعد روس کی انا سووا روانے "ترقی پسند تحریک اور اپٹا" کے متعلق انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ نامکمل اور مبہم تھا اور وہ اسے صحیح طریقے سے پیش بھی نہیں کر پا رہی تھیں۔ اسکے بعد پروفیسر قمر رئیس صاحب کا مقالہ جو سجاد ظہیر پر تھا امیر مغل نے پیش کیا (بہ سبب علالت پروفیسر قمر رئیس مائک تک نہ جا سکے تھے) پھر پروفیسر سید محمد عقیل صاحب کا نمبر آیا ان کے مقالے کا عنوان "سجاد ظہیر ایک ادیب ایک تحریک" تھا۔ ان مقالوں کے بعد سامعین کو دعوت دی گئی کہ وہ ان مقالوں پر اظہار خیال کریں۔ اس سے پہلے کہ بحث و مباحثہ کا آغاز ہوتا، پروفیسر محمد حسن صاحب نے اپنی بے جا مداخلت اور تنگی وقت کے سلسلے میں معذرت پیش کی اور اسی درمیان بخش لائل پوری کے شعری مجموعے "لہو کا خراج" اور علی احمد فاطمی کے رسالے "انداز بے" کی رسم اجرا کی گئی۔

بحث کا آغاز زاہدہ زیدی نے کیا۔ اس کے بعد ایک پاکستانی نوجوان اعجاز احسن نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تحریک پورے ہندستان پر اثر انداز نہ ہو سکی اور اس کی کیا وجہ ہے کہ جہاں اچھا لٹریچر بہت ہوا ہو وہاں سیاسی تجزیہ نگاری کا چلن عام نہیں ہوا۔ یہ سیاسی تجزیہ نگاری

صرف صفدر میر، عبداللہ ملک اور سبط حسن تک ہی کیوں محدود رہا۔ ملک راج آنند نے پہلے سوال کا جواب یوں دیا کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ تحریک پورے ہندوستان میں نہیں پھیلی۔ بنگالی میں شرت چندر سے لے کر اب تک جو کچھ لکھا گیا ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہے۔ پورا ہندوستانی ڈرامہ تحریک سے متاثر ہوا۔ جس کے نتائج آج خاص طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

ملک راج آنند کے بعد سردار جعفری مائک پر آئے اور بولے :

"علم و ادب میں ناہموار ترقی ہوتی ہے۔ جس وقت روس میں بڑا ناول لکھا گیا انگلینڈ میں نہیں لکھا گیا۔ روس نے آج تک شیکسپیئر نہیں پیدا کیا اور اردو میں بھی یہی صورت ہے۔ ہمارا مزاج بنیادی طور پر مشاعرے اور قوالی والا ہے۔ کئی کروڑ روپیہ مشاعرے اور غزل گائکی میں خرچ ہوتا ہے۔ ہمارے ادب کے پاس تاریخ ادب اردو پر کوئی اچھی کتاب نہیں ہے، جبکہ دوسری زبانوں کے پاس ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ کسی اور زبان کے پاس نہیں ہے۔ ہندستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد چھ کروڑ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے لیکن کتاب صرف ایک ہزار چھپتی ہے۔ ایسا ہی پاکستان میں بھی ہے۔ آنند نے سچی بات کہی ہے کہ ہم منظم ہو کر کام نہیں کر پاتے۔" اے

اس کے بعد عبداللہ ملک، سبط حسن اور پھر آخر میں پروفیسر محمد حسن نے اظہار خیال کیا اور اسی کے ساتھ یہ جلسہ ختم ہو گیا۔ اس جلسے کے بعد شام سات بجے مشاعرے کا آغاز ہوا اور جاوید حکیم قریشی نے اس کی نظامت کی۔ صدارتی ٹیم میں علی سردار جعفری، قمر رئیس اور بخش لائل پوری تھے۔ مقامی شعرا میں افتخار قیصر، شاہد ملک، خالد یوسف، فیروزہ جعفر، ہمراز احسن، باقر نقوی، حبیب حیدرآبادی، بخش لائل پوری، عاشور کاظمی، زہرہ نگاہ، ساقی فاروقی، اور فارغ بخاری وغیرہ تھے۔ جبکہ بیرونی شعرا میں ہمایوں ظفر زیدی، طفیل

خلش، شفیقہ فرحت وغیرہ تھیں۔

دوسرے دن یعنی ۴ اگست ۱۹۸۵ء کا پہلا اجلاس ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔ مجلس صدارت میں پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، پروفیسر تاسو رنگے، پروفیسر زاہدہ زیدی اور حمید اختر تھے۔ یہ اجلاس تحریک کے مسائل پر مقالات کے لئے مختص تھا۔ سب سے پہلے سردار کرنجیت سنگھ نے تقریر کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے "نئے مدینے کی تلاش" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس یا یہ کہیں کہ اس کانفرنس کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ ان مشہور و معروف ہستیوں کے درمیان نوعمر ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد پروفیسر ساجدہ زیدی کو زحمت دی گئی۔ انھوں نے اپنا مقالہ انگریزی میں پیش کیا۔ ان کا مقالہ تیسری دنیا کے مسائل اور انسانی قدروں سے متعلق تھا۔ یہ مقالہ تنگی وقت کی نظر ہو گیا۔ اس کے بعد پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے "ترقی پسند تحریک اور اردو ادب: منشور اور اعلان نامے کی روشنی میں" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پھر ڈاکٹر سکاچوف نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ سکاچوف کے بعد عبداللہ ملک جو کہ پروفیسر سید محمد عقیل کے حلیے سے بڑی حد تک مماثلت رکھتے ہیں مائک پر آئے اور انھوں نے بجائے مقالہ کے تقریر کی۔ اس کے بعد پروفیسر محمد حسن نے تقریر کی اور کہا کہ اب ہمیں سب سے زیادہ تنظیم کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ ترقی پسندی کے معاملے میں تو ہم کئی قدم آگے بڑھے ہیں۔ اس اجلاس میں مجلس صدارت کے کسی بھی ممبر نے اظہار خیال نہیں کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارتی ٹیم میں پروفیسر امین مغل، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور رضا ہمدانی شامل تھے۔ اس اجلاس کی نظامت بھی ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ہی کی۔ سب سے پہلے محمود الحسن رضوی نے "تنظیم و تحریک کے مسائل" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ دراصل انھیں یہ مقالہ پہلے اجلاس میں ہی پڑھنا تھا مگر اپنی غیر حاضری کے سبب وہ ایسا نہ کر سکے۔ جس سے اس جلسے میں یہ مقالہ کچھ بے محل سا ہو گیا۔ اس کے بعد شکیل الرحمن نے تمہید کے بہانے سے (صدر ہونے کا فائدہ اٹھا کر) انگریزی میں لکھا ہوا اپنا مقالہ پیش کر دیا اور وہاں سے چلے

گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ش. اختر جو کہ مارکسی ادیب ہیں، تیسری دنیا کے مسائل پر روشنی ڈالنے لگے۔ انھوں نے ہندستانی ادب وسیاست کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب وسیاست کا بھی جائزہ دے لیا۔ لیکن یہیں پر تنگی وقت اور انانیت کا پہلو بھی سامنے آیا بہت سے پاکستانی ادیب وشاعر نے اسے اپنے ملک اور اپنی ذات پر حملہ سمجھا۔ خاص کر مشہور دانشور سبط حسن نے بیچ میں ہی مداخلت کی اور انھوں نے کھل کر اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ "کسی دوسرے ملک کے ادیبوں کے بارے میں کوئی دوسرا بولے یا اعتراض کرے یہ اچھا نہیں ہے۔ میں بھی ہندستان کے مسائل پر تبصرہ کرسکتا ہوں، اعتراض کرسکتا ہوں، کیونکہ میں بھی واقف ہوں۔ کوشش کریں کہ ہم محبت اور پیار کی باتیں کریں۔" ماحول ذرا ناخوشگوار ہو گیا۔ ادیب ہندستانی اور پاکستانی میں تقسیم ہو گیا۔ علاقائیت حاوی ہونے لگی۔ سنجیدہ لوگوں نے سبط حسن کی مخالفت صرف اس لئے کی کہ انھوں نے اصول اور ترتیب کے خلاف بیچ میں ہی مداخلت کردی تھی۔ پروفیسر محمد عقیل رضوی نے کھڑے ہو کر کہا کہ بات اصول اور ترتیب کی ہے اگر اسی طرح سلسلہ چلے گا تو ہر عمل بگڑ جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سبط حسن صاحب واپس کیوں نہیں چلے آتے۔ پھر صفدر میر نے بھی کہا کہ "بات پروسیجر کی ہے سیشن کو ٹھیک سے چلنے دیجئے۔" حتیٰ کہ سردار جعفری اسٹیج تک آئے اور سبط حسن کو واپس لے گئے۔ معاملہ سرد پڑا اور پروفیسر فاطمی نے زاہدہ زیدی کو مائک پر بلایا۔ زاہدہ زیدی نے بھی جیسے تیسے اپنا مقالہ ختم کیا اس کے بعد ناروے کے سعید انجم، پاکستان کے فخر الزماں اور پھر پاکستان کے ہی احمد ہمدانی نے بھی اپنے مقالے پڑھے۔ ان سب کے بعد پروفیسر نامور سنگھ مائک پر آئے جو کہ ہندی دنیا کے واحد نمائندہ تھے۔ انھوں نے ایک اچھی اور متوازن تقریر کی۔ سب سے آخر میں سبط حسن صاحب مائک پر آئے اور انھوں نے کہا:

"میرا مقالہ لمبا ہے۔ میں اپنی کوئی بھی بات صرف دس منٹ میں نہیں کہہ سکتا اس لئے مقالہ نہیں پڑھوں گا، میں صرف باتیں کروں گا...... اس وقت سب سے بڑا مسئلہ فنڈامینٹلزم کا ہے، اس

سے نپٹنے کا ہے۔ ہم جو ہر وقت جدیدیوں اور فرائڈیوں سے الجھے رہتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ کسی نہ کسی منزل پر ہمارے ساتھ ہیں۔ فنڈامینٹلزم کا مسئلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوا جسے امریکی سامراج نے سہارا دیا۔ سماجی مسائل کو ہم نے نظر انداز کیا ......ہمارا کام مکڑی کے جالوں کو توڑنا ہے۔" ۲ے

اب صدارتی تقریر کی باری تھی اور امین مغل نے اس فریضہ کو انجام دیا۔

شام کو چار بجے آخری اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں صرف اعلان نامہ پڑھا گیا اور اس پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت علی سردار جعفری، ملک راج آنند، صفدر میر، قمر رئیس، امین مغل، شمیم اختر اور فارغ بخاری نے کی۔ اس آخری جلسہ میں قمر رئیس پہلی بار اسٹیج پر آئے اور انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اس جشن نے کانفرنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ہمیں ہر قدم پر اس تحریک کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اسے تمام بحران سے نکالنا ہوگا۔ نئی نسل کو سامنے لانا ہوگا۔ اس کانفرنس میں کچھ لوگ آ کر بہت خوش اور مطمئن ہوئے ہوں گے تو کچھ دوستوں کو مایوسی بھی ہوئی ہو گی۔ یہاں ہم کامیابی اور ناکامی کے لئے کم، خود احتسابی کے لئے زیادہ جمع ہوئے ہیں۔ نہ صرف اس پوری کانفرنس کا بلکہ پوری تحریک کا تجزیہ پیش کریں اور آئندہ سفر کے نشانات طے کریں۔" ۳ے

اس کے بعد صفدر میر اور علی سردار جعفری نے تقریریں کیں۔ پھر امین مغل نے انگریزی میں لکھا ہوا اعلان نامہ پیش کیا۔ اس پر تبادلۂ خیال کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے عبداللہ ملک نے امین مغل کو مبارکباد دی اور گزارش کی کہ ملکوں کے نام میں افغانستان اور نکارگوا کا اضافہ کر لیا جائے۔ ڈاکٹر نریش نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ کسی ملک کا نام نہیں آنا چاہئے۔ پروفیسر ناسور سنگھ کا خیال تھا کہ اعلان نامہ میں تیسری دنیا کا لفظ کوڈ میں کر دیا

چاہیے اور IPWA اپنے ساتھ صرف سوشلسٹ ممالک ہی نہیں بلکہ ان تمام ملکوں کو شامل کرے جو سرمایہ دار ملکوں سے لڑ رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ آخر میں ملک راج آنند نے منظور شدہ اعلان نامہ ایک بار پھر پیش کیا۔ عاشور کاظمی کے شکریے اور دو تین اعلانات کے ساتھ یہ کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس کانفرنس میں منظور اعلان نامہ اور تمام شرکاء کے مشترکہ بیان بالترتیب آگے درج ہیں جسے جناب ریاض صدیقی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

madlib.org

اعلان نامہ

گولڈن جوبلی کانفرنس (برطانیہ) میں منظور

ہم اہل قلم جو ترقی پسند تحریک کا جشن زریں منانے لندن میں جمع ہیں اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ادب سماجی تبدیلی کا موثر ذریعہ ہے اور صرف کمٹمنٹ ہی ہمارے وجود کو انسان اور ادیب کی حیثیت سے مستند کرتا ہے۔ فنی تخلیق اگر زندگی کے مسائل اور احترام سے مبرا ہو اور ایسے تصورات کی اشاعت کرے جو انسانی فلاح اور ترقی کے دروازے بند کر دے تو وہ زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں سے عاری اور بے مقصد ہوتی ہے۔ ہم اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ سماجی شعور سے عاری ادب اور فنون لطیفہ کے تمام تصورات نہ صرف غیر ذمہ دارانہ ہیں بلکہ ایسے تمام رجحانات اور تصورات انسانی تمدن اور تاریخ کی غلط تاویل کا نتیجہ ہیں۔ ہم مواد اور موضوع پر فارم اور تکنیک کی برتری کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں زبان کے وسائل، فارم، تکنیک اور بامعنی روایت کا تخلیقی استعمال ادیب کی فنکارانہ ذمہ داری ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ ادب، آرٹ اور وہ سب کچھ جو مقدس، خوبصورت اور بامعنی ہے اس کی تخلیق امن اور آزادی کے ماحول میں ہی ممکن ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اہل قلم کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اہم اور ذمہ دارانہ تخلیق کے منافی ہے۔

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہمیں اس صدی کے سب

سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان اور ہمارے اس کرۂ ارض کی مکمل تباہی اور تاراجی کا خطرہ، جو نیوکلیائی بموں کے انبار سے آگے بڑھ کر اسٹار وار کے اسلحہ کی ایجادات کی صورت میں خوفناک حقیقت بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے کہ ہم بنی نوع انسان اور اس کی آنے والی نسلوں کو ہلاکت سے بچانے کے لئے تمام امکانی ذرائع کو بروئے کار لائیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مفاد پرستوں کے ہاتھوں اطلاع رسانی اور میڈیا کے وسائل کا بے جا اور گمراہ کن استعمال ادب کی نشو و نما کے منافی ہے۔

ہم بنیاد پرستی کو خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، رد کرتے ہیں۔

ہم یقین رکھتے ہیں کہ ساری زبانیں اور ثقافتیں قابل احترام ہیں اور کسی بھی زبان اور ثقافت کو ہر قسم کے تعصبات اور امتیازات سے آزاد، بڑھنے اور ترقی کرنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ ہم اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ ادب ناقابل تقسیم ہے اور ہر زبان کا علمی و ادبی سرمایہ عالمی ادب کا حصہ ہے۔

ہم تہذیب و ثقافت کے کارکن، عوام کے ساتھ ہیں۔ ہم انسانی وقار اور انصاف کے لئے سرفروشانہ جد و جہد کرنے والے ان کروڑوں مظلوم اور محنت کش انسانوں کا ساتھ دینے کا عہد کرتے ہیں جو امن، سلامتی، ترقی اور اپنی قومی سماجی اور ثقافتی آزادی کے لئے نبرد آزما ہیں۔

ہم دنیا کے دوسرے ممالک کے اہل قلم اور دانشوروں کے

ساتھ اتحاد اور یگانگت کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم پوری دنیا کو اپنی بستی سمجھتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ تیسری دنیا کے باشعور عوام اور دانشور باہمی طور پر اور قریب آئیں۔ ایشیا اور افریقہ کے تخلیق کاروں کے ساتھ ہماری ہم آہنگی نے لاطینی امریکہ میں اپنے ہم عصر اہل قلم کے ساتھ ہمارے تعلقات کے امکانات روشن کردیئے ہیں اور توقع ہے کہ باہمی تبادلوں کے ذریعہ مشرق کا ادبی و ثقافتی ورثہ مغرب تک پھیل جائے گا۔

ہم اپنے عہد کی ان تمام پیش رو ہستیوں سے مکمل اتحاد کا اعلان کرتے ہیں جو بنی نوع انسان کی نجات کی جدوجہد، قوموں کے درمیان جذبۂ اخوت کی اشاعت اور آلودگی سے پاک پانی، ہوا اور فضا میں انسان کے زندہ رہنے کی بنیادی حقوق کی علامت ہیں۔ ہم اپنے عہد کا ایک بار پھر اعادہ کرتے ہیں کہ مستقبل میں ہماری ساری سرگرمیاں انسان دوستی کے اس لازوال جذبہ سے مربوط رہیں گی جسے دنیا کے پیش رو باشعور عوام اور دانشور ہماری طرح عزیز رکھتے ہیں۔" ۳ے

گولڈن جوبلی کانفرنس (برطانیہ) کے شرکاء کا بیان

پچاس سال پرانی بات ہے جب ہندستانی ادیبوں کی ایک جواں سال جماعت نے ایک منشور شائع کیا تھا، جس کا مقصد جنوبی ایشیاء کے خطے میں جس کو برصغیر کہا جاتا ہے ایک منفرد ادبی تحریک کا قیام تھا۔ اس زمانے میں دنیا کے کروڑوں لوگوں نے اس سامراجی اور نوآبادیاتی تسلط کو پوری قوت کے ساتھ چیلنج کیا تھا۔ جس کے لئے پرانے زمانوں سے یہ تصور موجود تھا کہ اس کو کمزور کرنا محال ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہی چیلنج سب سے بڑی حقیقت بن گیا تھا۔ ہم نے اس وقت سے آج تک بہت طویل فاصلہ طے کرلیا ہے۔ سب نہ سہی لیکن بعض نوآبادیات آزادی حاصل کرچکی ہیں۔ جن میں وہ ہندستان بھی ہے جس کے بطن سے دو آزاد و خودمختار ریاستیں ظہور پذیر ہوئیں ہیں۔ دوسرے علاقے بھی آزادی و خودمختاری حاصل کرنے ہی والے ہیں۔ سوشلسٹ ملکوں کی ایک مضبوط دولتِ مشترکہ وجود میں آچکی ہے اور سامراجیت شدید بحران سے دوچار ہے۔

اس وقت سامراجیت لرزہ براندام ہے اور خود کو بچانے کے لئے فوجی قوت کو استعمال کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ دورِ جدید کے دوسرے سائنسی و تکنیکی انقلاب نے مفید اور مثبت نتائج سے استفادہ کے لئے ہزارہا امکانات پیدا کردیئے تھے۔ اگر ان کو عوام کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے استعمال کیا جاتا تو اس وقت کرۂ ارض پر انسانیت امن و آشتی کے ساتھ خوشحالی کی

سوغات سمیٹ رہی ہوتی لیکن سامراج نے اس عظیم الشان انسانی انقلاب کو تخریب، اسلحہ سازی اور اسلحہ سازی کے مقابلے کی دوڑ کا ذریعہ بنا کر پورے دھارے کو تباہی کی طرف موڑ دیا۔ بیرونی خلا اور سیاروں کی تسخیر سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کو بھی عوام دشمن مقاصد کے لئے کام میں لایا جارہا ہے اور خلائی جنگ (اسٹاروار) کی صورت پیدا کر دی گئی ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے انسانی معاشرہ آج ایک ایسے غیر یقینی موڑ پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں مکمل فنا اور ہلاکت کا عفریت سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کسی ایک لمحہ میں رونما ہونے والا کوئی نیوکلیائی واقعہ پوری دنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہے۔ اس اکلوتے سیارے یعنی زمین کا وجود جہاں تخلیق حیات کا معجزہ انسانیت کے ارتقاء کا محرک ثابت ہوا خطرہ میں ہے۔ روایتی جنگوں کے برعکس یہ تیسری عالمگیر جنگ علاقائی سالمیت اور بڑی جنگوں کو روکے رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی جنگوں جیسے بنائے گئے اصولوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دے گی اور مختلف علاقوں کی آزاد و خود مختار سرحدیں دھواں دھواں ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ واقعی اس اعتبار سے ایک عجیب جنگ ہو گی کہ ہمیشہ کے لئے تمام چھوٹی جنگوں کا خاتمہ کر دے گی۔ انسانیت نے اپنی پوری تاریخ میں اپنی سہولتوں، مسرتوں اور ضرورتوں کے لئے جو کچھ بھی پیدا کیا اور بنایا ہے، تیسری جنگ اس کے تمام آثار مٹا دے گی۔

صورت حال کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ہے۔ مختلف علاقوں اور سمندروں کو فوجیایا جارہا ہے۔ مغرب کی سرزمین پر دو بڑی

قوتیں آمنے سامنے ہیں اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہیں۔ فلسطینی اور یمنی عوام کے جائز حقوق اور خواہش آزادی کا پامال کیا جانا، جنوبی افریقہ میں مٹھی بھر اجنبی حکمرانوں کی سرپرستی اور دنیا بھر کے پس ماندہ و ترقی پذیر ملکوں میں آزاد جمہوری و ترقی پذیر معاشروں کو طاقت اور سازشوں کے ذریعہ گرفت میں لیا جانا وہ مظاہر ہیں جن سے ان علاقوں کے عوام برسرپیکار ہیں۔ غیر نمائندہ اور نامقبول حکومتوں کا قیام اور پھر ان کو فوجی و اقتصادی اور سیاسی تعاون کی چھتری فراہم کر کے مستحکم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس صورت حال کی مدد سے ترقی پسند جمہوری حکومتوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے براعظموں میں ترقی پسند شعور اور عمل کو برابر روکا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیا اور اس کے اطراف کی صورت حال خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ ان علاقوں میں نئے نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل کے لئے سامراجیت فوجی ٹولوں کو مسلط کر رہی ہے۔ بحر ہند میں فوجوں کی موجودگی ایک حقیقت ہے اور اس علاقے میں فوجی اڈے قائم کرنے کے منصوبے بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ ان تمام ملکوں کی جو عدم وابستگی کے نظریہ پر چلتے ہوئے اپنے سماجی و اقتصادی نظام کو جمہوری اور ترقی پسندانہ خطوط پر ڈھالنے کا عزم رکھتے ہیں۔ غیر نمائندہ اور نامقبول حکومتوں کو اس عزم سے روکنے کے لئے اقتصادی، فوجی اور سیاسی مدد دی جا رہی ہے۔ فوجی حکمرانوں سے ان کے اپنے ملکوں میں عوام اور مختلف قومیتوں پر تسلط کو زندہ اور مضبوط

رکھنے کے لئے ان سے دوستانہ تعلقات کی استواری اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اس طرح فوجی حکمران بنیادی انسانی جمہوری، شہری، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کو مسترد کر کے لوگوں پر نو آبادیاتی پالیسی کا خود ساختہ "بنیاد پرستی" کے تصور سے عبارت فلسفہ مسلط کر رہے ہیں۔ ان مقاصد تک پہنچنے کے لئے ایک سازشی قسم کی سرد جنگ شروع کر دی گئی ہے، جو لوگوں میں بےچینی اور تشویش پیدا کرنے کا سبب ہے۔ سامراجی ملکوں کی اقتصادیات کے تانے بانے میں بھی فوج کی حصہ داری کو اصول بنایا گیا ہے اور اسی طرح ان ملکوں کی حکومتوں کو بھی فوجی ساز و سامان سے لیس کیا جا رہا ہے جو سامراج کے پنجۂ گرفت میں ہیں۔

تیسری دنیا کے ملکوں پر مالیاتی سرمائے (فائنانس کیپٹل) کی گرفت سخت ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں اتنی بھی اہلیت باقی نہیں رہی ہے کہ وہ آزادی و خودمختاری کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور ترقی کا سفر اپنے ارادوں اور اپنی مرضی سے طے کرنے کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ نئے نو آبادیاتی نظام کے ہاتھوں میں کھلونا ہونے کی وجہ سے ان ملکوں میں بین الاقوامی تجارتی کارپوریشنوں نے وہاں موجود انسانی وسائل کو ہی سمیٹنا شروع کر دیا ہے اور مالی تعاون کے نام سے دی جانے والی امداد اور مہیا کئے جانے والے قرضوں نے ان ملکوں کو اقتصادی بدحالی کے پہاڑ تلے دبا دیا ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے قرضوں کی مقدار تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جاری ہے۔ اس طرح پیدا ہونے والی صورت حال کا کرب، بھوک، بیماری، قحط، ہلاکت، بے

روزگاری، جہالت ہوش وحواس اڑا دینے والی گرانی اور ثقافتی پسماندگی کی صورت میں عام لوگوں کے کاندھوں پر مسلط ہے۔ یہی اس وقت تیسری دنیا کا منظر ہے۔

نئی نوآبادیاتی استحصال کی تکنیک بہرحال تیسری دنیا کے لوگوں میں ایک ایسے مشترک اجتماعی شعور کو پروان چڑھا رہی ہے جس کے صاف وشفاف شیشوں سے وہ ان حالات کا چہرہ دیکھ رہے ہیں جو تقدیر بن کر ان کے وجود سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اسی احساس کے نتیجہ میں وہ ایک نئے تر و تازہ، زیادہ بہتر عالمی اقتصادی نظام کی ترویج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں عوامی قوتیں سامراجی عزائم کے راستوں میں کانٹے بچھا رہی ہیں۔

افکار و نظریات کی قلمرو میں آج جو جدوکشاکش دکھائی دے رہی ہے اس سے پہلے اتنی شدید اور تیز رفتار نہیں تھی، چونکہ سامراجیت اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور منوانے میں بری طرح ناکام ہوئی ہے اس لئے لوگوں کی جدوجہد میں ربط اور نظم و ترتیب کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت جو نئی سرد جنگ رونما ہوئی ہے وہ اسی صورت حال کی نشاندہی کرتی ہے۔

سامراجی نظریات جن خیالات کا تانا بانا تیار کر رہے ہیں وہ غیر فطری بھی ہیں اور غیر انسانی بھی ہیں اور ہر صورت میں سماجی ارتقاء کے سماجی قوانین سے متصادم ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد انسانوں کو ان کی اپنی صلاحیتوں پر اعتماد و اعتبار، تاریخ کے ارتقائی و تعمیری شعور اور مختلف عوامی طبقات کو یکجائی اور ہم آہنگی سے محروم کرنا

ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مختلف و متضاد طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ سامراج اپنے اور تیسری دنیا کے ملکوں میں موجود مختلف طبقوں کے تعصبات کو استعمال کر رہا ہے۔

حقیقت کی جگہ غیر حقیقت اور دلیل کی جگہ مجرد خیال کی برتری کا تصور اسی مہم کا حصہ ہے۔ کائنات کے مطالعے سے حاصل ہونے والی آگہی کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ فرد، سماج اور قدرتی محرکات کے درمیان علت و معلول کے رشتوں کی تردید ہو رہی ہے۔ لمحے کو وقت کے تسلسل سے علیحدہ کر کے لازمانیت کے لمحے کی شان و شوکت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تاریخ کو غیر مسلسل اور غیر مربوط زمانوں کا درجہ دے کر سماجی ارتقاء کے سائنسی طریقہ کار کی نفی کی جا رہی ہے تاکہ ایک حقیقی انسانی سماج کے لئے کی جانے والی جدوجہد کے بارے میں لوگ تشکیک کا شکار رہیں۔ تاریخ کے حوالوں سے اس احساس کو پروان چڑھایا جا رہا ہے کہ اس قسم کی جدوجہد ایک احمقانہ فعل ہے۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں تقدیر پرستی کے یقین کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ فرد کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ اس کا سماجی رشتہ ایک بے معنی تصور ہے۔ گویا اصل حقیقت فردیت اور ذات ہے۔ فرد اس لامتناہی کائنات میں صرف ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح فرد کو سماج اور قدرت سے انکار پر مائل کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر قوتوں کا وجود نہیں ہے اور زندگی بے معنی اور لغو چیز ہے۔ انسانی فطرت اور مزاج کی مجذوب کی بڑ تصور کیا جاتا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ تو بس ایک حیاتیاتی وجود ہے جو قدرت کے

بے رحم ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ مایوسی اور بے معنویت کو انسان کا مقدر قرار دیا گیا ہے۔ جنگ، تشدد اور جارحیت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا جارہا ہے کہ یہ انسان کی فطری جبلت ہے اور اس حقیقت کو یقین اور حوصلہ مندی کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے۔ تجدید و اصلاح کے نام پر ماضی پرستی کو ازسرنو ہوا دی جارہی ہے۔ ماضی کے شاندار و پروقار مناظر پیش کئے جارہے ہیں۔ دیو مالائی اور اساطیری زمانوں کی معنویت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہے۔ ماضی پرستی کے ان قدامت پسندانہ رجحانات کو تیسری دنیا میں پھلنے پھولنے کے مواقع دیئے جارہے ہیں۔ ماضی پرستی کے اس میلان کی مدد سے عہد گذشتہ کی اقدار اور پرانے دور کے بعض اداروں کو زندہ کیا گیا ہے تاکہ اس خطہ زمین پر جاگیردارانہ اور اسی قسم کے نظاموں کو زندہ رہنے اور کام کرنے کے لئے سازگار حالات مل سکیں۔ اور نئے نوآبادیاتی سسٹم کو قوت دے کر عوام کی بے حرمتی کی جاتی رہے۔ ان کے علاوہ انسان، سماج اور قدرت کے بارے میں نت نئے نظریات کا جال پھیلایا گیا ہے تاکہ لوگوں کی متحد قوت کو توڑ کر ان کو مختلف گروہوں، ٹولیوں اور سمتوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک مخصوص طرز معاشرت یا موروثی اقتدار کے زیر سایہ پلنے بڑھنے والی طرز معاشرت کی ہمیشگی کو ثابت کرنے کے لئے ان کو فلسفیانہ نظریات کا لباس پہنایا جارہا ہے جن کا مقصد فرد کی حکمرانی کے لئے جواز تلاش کرنا اور لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں معتبر و پروقار بنا کر پیش کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے "ہیرو پرستی" کے شعور کی ہمت افزائی کی جا

رہی ہے تاکہ اکثریت پر اقلیت کی حکمرانی کے لئے علمی وفکری جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس طرح جمہوری اداروں اور شعور کے ارتقاء کو بے اثر بنانے کے لئے آمریت کو مستحکم ہونے کا موقع دیا جارہا ہے۔

مذہب وعقائد، رنگ ونسل، جنس، خاندان کے تفریق کے شعور اور پراگندگی وفحاشی کو آزادی کے نام پر عام کرکے ان سے پید اہونے والی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے فطری اصول کو کمزور کرنے کے لئے تنگ نظری، فرقہ وارانہ جنون اور انتہاپسندی کے رجحان کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔ قوم کی وسیع تر تصور کو زائل کرنے کے لئے حب الوطنی کی جگہ علاقائی وقبائلی شعور کو ہوا دی جاری ہے۔ جب کہ کثیر الاقوامی ریاستوں میں قوم کی سالمیت کے نام پر قومیتوں کے حقوق، ان کی ثقافت اور زبانوں کو نظر انداز کرنے کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ بین الاقوامیت کے ابھرتے ہوئے احساس کی سمت کو موڑنے کے لئے کائنات کے تصور کو اچھالا جارہا ہے۔ ان تمام کاروائیوں کا مقصد لوگوں میں بے زمینی کے احساس کو جنم دینا ہے۔ مختصراً یہ کہ زندگی کو جامد وبنجر بنا کر اس کے ارتقائی عمل کو روک دینا ہی اصل مقصد ہے۔ ذہین اور محنت کش طبقوں کے مختلف گروہوں کو مختلف طریقوں سے نااہل بنانا اسی سلسلے کی کڑی ہے تاکہ وہ لوگوں کے ہجوم یعنی سماج سے کٹ کر تنہائی کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کرلیں اور اس طرح راضی خوشی اپنے آقاؤں کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور ان کا آلۂ کار بن جائیں۔ ایسے ماحول میں سامراجی قوتیں خود ساختہ معلومات کی

اشاعت کے ذریعہ عوام کے شعور و احساس اور ان کی زندگیوں کے رخ کو متعین کرتی ہیں۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف یہ کہ حقیقت مسخ ہو جاتی ہے بلکہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دنیاؤں کے درمیان اطلاعات کی غیر متوازن ترسیل شروع ہو جاتی ہے۔

نظریات و افکار کی نشو و نما کے لئے سب سے زیادہ موثر اور حساس وسیلہ ادب کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامراجی ملکوں اور اس کے حواری ملکوں میں ادب کی تعبیرات و تشریحات کے منصب کو بھی ایک ذریعہ کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے اور عوام کے حقوق کی آوازوں کو بے اثر بنانے کے لئے ادب سے کام لیا جا رہا ہے۔ ادب میں انتشار کو ہوا دی گئی ہے۔ قومی سالمیت کے تحفظ، امن عامہ اور قانون کی حرمت کے نام پر آزادئ اظہار کو پابند کیا جا رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ پر سنسر اور قبل از اشاعت سنسر نافذ کرنا اور ترویج و اشاعت کی آزادی کے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا اس حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ ادیبوں پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں اور جہاں بھی ان کے خیالات و نظریات حکمرانوں کے عزائم کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ان پر الزامات عائد کر کے ان کو قانون کی گرفت میں لیا جاتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کو دار و رسن سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح سنجیدہ اور نظریے پر مبنی معیاری ادب کے راستے روک کر بازاروں میں عامیانہ ادب کی تجارت کے لئے فضا بنائی جاتی ہے اور بازاروں میں فحش، جنسی خیز اور ہیجانی ادب کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورت حال ایک طرف ادیبوں کو سنجیدہ اور معیاری

ادب تخلیق کرنے سے روکتی ہے اور دوسری طرف غیر معیاری ادب کی قبولیت اور مالی فائدے کے امکانات ان کو غیر معیاری ادب کی تخلیق پر مائل کرتے ہیں۔

نظریات و افکار کی قلمرو میں انتشار، نراجیت، تصوف پسندی اور وہ ناموزوں فضا جس میں ادیب زندگی بسر کرتا ہے ایک مستقل ماحول بن گیا ہے۔ ادب کی سماجی وابستگی کے شعور کو بے نام کرنے کے لئے 'ادب کی خودمختاری' کے نظریے تراشے گئے ہیں جن کا مقصد ادب کے سماجی رشتے اور عمل کی نفی کرنا ہے۔ فارم اور مواد کے درمیان موجود جدلیاتی رشتے کو کمزور کر کے مواد کو فارم پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ ادب کا اصل مقصد فارم اور تکنیک میں کمال کا حصول قرار پایا ہے۔ جبکہ دوسری طرف فارم کو بالکل مسترد کیا جا رہا ہے۔ زبان کی توڑ پھوڑ اور نئی زبان کی تشکیل کا نظریہ پھیلایا گیا ہے۔ ایک طرف روایت کا نام لے کر نئے اجزاء کو بے دخل کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ذریعہ روایت سے استفادے میں ناکامی پر نقاب ڈالنے کے لئے عوامی تاریخ کے تسلسل کا نظریہ مسخ کیا جا رہا ہے۔ ایسے خیالات و موضوعات کے انتخاب کی ہمت افزائی ہو رہی ہے جو صورت حال کو اسی طرح قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوں۔ سامراجی فضا کے زیر سایہ تخلیق ہونے والے ادب میں شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور قدرت کے مسخ شدہ تصویر پیش کی جاتی ہے کیونکہ یہ تخلیقی کاوشیں زندگی اور قدرت کے بارے میں مسخ کئے گئے تصورات سے جنم لیتی ہیں۔

بعض حساس ادیب ایسا ادب ضرور تخلیق کرتے ہیں جو نئے نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کا تھوڑا بہت عکس پیش کرتا ہے اور ان کے عزائم کو بے نقاب بھی کرتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ ادب بھی مسخ شدہ وژن ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک مخصوص طبقہ یا طبقات کی مایوس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے باور کراتا ہے کہ ان کے اطراف موجود نظام میں ان کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اور پھر اپنے ان دعووں کو یقینی قرار دے کر اپنے ذاتی تجربے کو پورے سماج کے تجربے کا ترجمان قرار دیتا ہے۔ حقیقت کو اس طرح مسخ کرتے رہنا ضروری ہے کہ ظلم و ناانصافی اور استحصال و پس ماندگی کے خلاف دنیا بھر کے لاکھوں عوام کی جدوجہد ان کے دعووں کی قلعی کھولتی ہے اور ان کے ذاتی تجربات کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔

دنیا بھر میں امید اور اعتماد کی فضا بہر حال موجود ہے۔ اس ساری ہم بازی کے پیچھے یہ جذبہ کار فرما ہے کہ علم و آگہی کے ذریعے شب و روز پھیلتے ہوئے شعور کے دھاروں کو مختلف سمتوں میں موڑ کر منتشر کر دیا جائے۔ بیسویں صدی میں انسان نے پہلی بار ایسی حقیقی دنیا کے وجود کو دیکھا ہے جہاں فرد کے ہاتھوں فرد کے استحصال کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جہاں آزادی، مسرت اور آسودگی کا راج ہے۔ تخفیف اسلحہ، قیام امن اور انسان دوستی کے لئے بیدار ہونے والا شعور تیسری دنیا کی نمایاں تحریک بن گیا ہے۔ مغرب میں عورت نے مرد کے مساوی حقوق حاصل کر لئے ہیں۔ تیسری دنیا میں بھی مردوں کی تنگ نظری اور جارحانہ روش اور عورتوں کے مساوی حقوق کے خلاف کام

کرنے والے اداروں کی کارکردگی کے باوجود یہاں کی خواتین حقوق طلبی کے لئے میدان میں آگئی ہیں۔ تیسری دنیا میں آزادی کے حق سے لے کر ایک پُروقار زندگی گزارنے کے مطالبے تک کے لئے ابھرنے والی جدوجہد اب ناقابلِ تسخیر مہم بن چکی ہے۔ سامراج اور اس کے حواریوں کی شدت کا ایک سبب اس تحریک کو روکنے میں ناکامی بھی ہے۔

تاریخ کے ایسے اہم موڑ پر ہم اہل قلم کا عوام کی صفوں میں رہنا ہی ہمارا نصب العین ہے۔ ادیبوں کی شاندار کارکردگی ایک حقیقت ہے۔ انھوں نے محرومی و حقوق پر ڈاکہ زنی کے خلاف ابھرنے والے شعور اور قید و بند کی صعوبتوں کو حوصلے اور جرأت کی روشنی سے مالا مال کیا ہے اور بعضوں نے تو مقاصد کی تکمیل کے لئے جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے ہیں۔ ہم تمام لکھنے والے جو ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر یہاں جمع ہوئے ہیں، کلچر کے ان باہمت اور حوصلہ مند ساتھیوں کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ہم دنیا کے دوسرے حصوں میں موجود ترقی پسند لکھنے والوں کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جو ثقافت پر شب خون مارتے ہیں۔ ہم مختلف کثیر الاقوامی ملکوں کی لسانی اقلیتوں کی زبانوں کے حق سے کیے جانے والے انکار کو قبول نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک کثیر اللسانی ریاستوں کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو علاقائی کے بجائے قومی زبانیں کہنا چاہیے اور ان کو مساوی حقوق و مراتب حاصل ہونا چاہیے۔

ہم لکھنے والے اس اعزاز پر نازاں ہیں کہ ہم ان ترقی پسند لکھنے والوں کے جنھوں نے پچاس سال پورے کر لیے ہیں، وارث اور ان کے تسلسل کی ضمانت ہیں اور اسی دھارے کا حصہ ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تمام ملکوں اور براعظموں کے ترقی پسند لکھنے والوں سے انفرادی سطح کے علاوہ ادبی اداروں مثلاً افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم کے ذریعہ رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جنوبی ایشیاء میں موجود مختلف زبانوں کے ادبی اداروں کی مدد سے ایسا انتظام کیا جائے کہ باہمی صلاح، مشوروں اور تبادلۂ خیال کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے۔

نو آبادیاتی اور نئے نو آبادیاتی نظام کے خلاف ترقی پسند ادبی تحریک کا تجربہ مفید ہی نہیں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اس نے جنوبی ایشیاء کے ادب میں فاصلوں کی دیواریں گرا دی ہیں اور علاقے کے ادب کو بین الاقوامی ادب کے تانے بانے کا حصہ بنایا ہے، جس کے بغیر برصغیر میں جدید ادب کے وجود کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسی طرح آج بھی ترقی پسند ادیبوں کے فکر و نظر کو نظر انداز کر کے جنوبی ایشیاء کے ملکوں میں کسی ادبی تاریخ کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک نے قارئین اور لکھنے والوں کے طرز احساس کو کروٹ دی ہے۔ اس نے ایک نئی ذوقیات کی بنا استوار کی ہے اور ہیئت اور مواد کے بارے میں جدیدیت اور بعد از جدیدیت کے زیر اثر پھیلنے والے توہمات کی قلعی کھولی ہے۔ اس حقیقت کو طشت از بام کیا ہے کہ ادب کی سماج اور سماجی تغیرات سے وابستگی سب سے بڑی

سچائی ہے۔ اس نے لفظوں، استعاروں، علامتوں اور امیجز کو نئے چہرے اور لباس عطا کئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے جنوبی ایشیائی ملکوں کو جو سرمایہ فکر دیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

فاشزم، سامراجیت، نئے نو آبادیاتی و نو آبادیاتی عزائم اور جاگیرداری کے خلاف اس تحریک کی جد وجہد، آمریت کے خلاف جنگ، استحصال، مختلف قسم کے امتیازات مثلاً ذات پات کی تفریق کے خاتمے، توہمات اور قدامت پسندی، انتہا پسندانہ جارحیت، مجرد خیال پرستی، ابہام اور بنیاد پرستی کے خاتمے کے ساتھ امن، جمہوریت اور سماجی انصاف کے حصول کی سب سے بڑی اور موثر جد وجہد تھی۔ ان عظیم انسانی مقاصد کے حصول میں ترقی پسندوں اور ان کے ہمنواؤں کی قربانیاں تاریخ کا روشن چراغ ہیں۔

اس تحریک کے کارکن اب بھی اپنے پیش روؤں کی روایات کو آگے بڑھانے اور تحریک کے تسلسل کو جاری رکھنے سے منہ نہیں موڑیں گے کیونکہ ہماری نجات کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ ۵ے

حواشی

۱ے روشنائی از سجاد ظہیر صفحہ ۹۳

۲ے پریم چند کا خطبہ "ادب کی غرض وغایت" سے ماخوذ

۳ے پریم چند کا خطبہ "ادب کی غرض وغایت" سے ماخوذ

۴ے پریم چند کا خطبہ "ادب کی غرض وغایت" سے ماخوذ

۵ے حسرت موہانی کی تقریر کا اقتباس از روشنائی صفحہ ۱۲۳

۶ے Towards prograssive literature published by Syed Sajjad Zaheer

۷ے Towards prograssive literature published by Syed Sajjad Zaheer

۸۔ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از کرن سنگھ چوہان صفحہ ۱۷۰۔۱۷۱
۹۔ گفتگو :ترقی پسند ادب نمبر
۱۰۔ گفتگو : ترقی پسند ادب نمبر ص ۳۳۔۳۷
۱۱۔ گفتگو : ترقی پسند ادب نمبر ص ۳۸
۱۲۔ گفتگو : ترقی پسند ادب نمبر ص ۳۹۔۴۳
۱۳۔ گفتگو :ترقی پسند ادب نمبر
۱۴۔ خواتین لٹریچر ۱۹۳۹ء شمارہ ۱ صفحہ ۱۱۳۔۱۱۴
(مشمولہ پرگتی وادا ور ساما نتر ساہتیہ از ریکھا اوستھی صفحہ ۳۳۹۔۳۴۰ سے ترجمہ)
۱۵۔ روشنائی صفحہ ۲۸۰
۱۶۔ روشنائی صفحہ ۲۸۳
۱۷۔ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از کرن سنگھ چوہان صفحہ ۴۹۔۵۰
۱۸۔ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از کرن سنگھ چوہان صفحہ ۵۱
۱۹۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی لائبریری میں موجود دستاویز سے
بحوالہ پرگتی وادا ور ساما نتر ساہتیہ از ریکھا اوستھی صفحہ ۳۴۱۔۳۴۳ سے ترجمہ
۲۰۔ روشنائی از سجاد ظہیر ص ۳۶۳
۲۱۔ پودے از کرشن چندر ص ۱۰
۲۲۔ روشنائی از سجاد ظہیر ص ۳۷۰۔۳۷۱
۲۳۔ پودے از کرشن چندر ص ۹۷
۲۴۔ ترقی پسند ادب کی تحریک از سجاد ظہیر
مشمولہ نیا ادب (حیدرآباد) ایڈیٹر قاضی عبدالغفار ص ۷۔۹
۲۵۔ ترقی پسند ادب کی تحریک از سجاد ظہیر
مشمولہ نیا ادب (حیدرآباد) ایڈیٹر قاضی عبدالغفار ص ۱۰
۲۶۔ ترقی پسند ادب کی تحریک از سجاد ظہیر
مشمولہ نیا ادب (حیدرآباد) ایڈیٹر قاضی عبدالغفار ص ۱۴۔۱۶
۲۷۔ ترقی پسند ادب کی تحریک از سجاد ظہیر
مشمولہ نیا ادب (حیدرآباد) ایڈیٹر قاضی عبدالغفار ص ۱۸۔۱۹

۲۸ ترقی پسند ادب کی تحریک از سجاد ظہیر

مشمولہ نیا ادب (حیدرآباد) ایڈیٹر قاضی عبدالغفار ص ۳۱_۳۲

۲۹ رپورتاژ پودے از کرشن چندر ص ۵_۱۱

۳۰ رپورتاژ پودے از کرشن چندر ص ۵_۱۱

۳۱ سہ ماہی رسالہ 'آب و گل' جلد ۱ شمارہ ۲ صفحہ ۱۷۰

۳۲ سہ ماہی رسالہ 'آب و گل' جلد ۱ شمارہ ۲ صفحہ ۱۸۰

۳۳ پرگتی وادی آندولن کا اتہاس از کرن سنگھ چوہان صفحہ ۲۰۰

۳۴ ترقی پسند تحریک پر ایک نظر (یہ مضمون ۲۷ ستمبر ۲۰۰۵ کو جامعہ اسلامیہ میں پڑھا گیا)

۳۵ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۲۳_۲۵

۳۵

۳۷ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۳۷

۳۸ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۸

۳۹ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۵

۴۰ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۶

۴۱ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۶

۴۲ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۷

۴۳ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۷

۴۴ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۳۹

۴۵ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۱۲

۴۶ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۱۵

۴۷ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۱۵

۴۸ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۱۵

۴۹ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۴۰

۵۰ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۴۱

۵۱ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۴۱

۵۲ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۴۱_۴۲

۵۳ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۴۲

۵۴ ماہنامہ شاہراہ: مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء کانفرنس نمبر صفحہ ۲۰_۲۱
۵۵ جدید سوسائٹی میں ادیب کی ذمہ داریاں از ملک راج آنند مشمول رسالہ گفتگو شمارہ ۱: ۱۹۶۷ء
۵۶
۵۷ حسینی شاہد کی رپورٹ: ہماری زبان ۸ر جولائی ۱۹۷۵ء
۵۸ حسینی شاہد کی رپورٹ: ہماری زبان ۸ر جولائی ۱۹۷۵ء
۵۹ حسینی شاہد کی رپورٹ: ہماری زبان ۸ر جولائی ۱۹۷۵ء
۶۰ حسینی شاہد کی رپورٹ: ہماری زبان ۸ر جولائی ۱۹۷۵ء
۶۱ رسالہ گفتگو جلد ۱۲_۱۱ صفحہ ۱۳
۶۲ رسالہ گفتگو جلد ۱۲_۱۱ ۷۶_۱۹۷۵ صفحہ ۱۳_۱۴
۶۳ رسالہ گفتگو جلد ۱۲_۱۱ ۷۶_۱۹۷۵ صفحہ ۱۴
۶۴ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر: مرتب پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی صفحہ
۶۵ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۶۳
۶۶ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۶۷_۶۸
۶۷ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۶۹_۷۰
۶۸ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۷۱_۷۲
۶۹ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۷۲_۷۳
۷۰ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۷۷
۷۱ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۸۱_۸۲
۷۲ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۹۳
۷۳ سفر بے شرط از پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ
۷۴ ترقی پسند ادب۔ دستاویزات صفحہ ۱۹۵ گولڈن جوبلی کانفرنس، کراچی ۱۹۸۶ء
۷۵ ترقی پسند ادب۔ دستاویزات صفحہ ۱۸۶ گولڈن جوبلی کانفرنس، کراچی ۱۹۸۶ء

maablib.org

ضمیمہ - ۶

باب سوم

ترقی پسند تحریک کا تجزیہ

ڈاکٹر سید عبدالقیوم شمسی

تنقیدی تجزیہ

ترقی پسند تحریک نے ایک خاص مقصد اور رجحان کے تحت اپنا کارواں آگے بڑھایا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ادب کو "ادب برائے ادب" کے حصار سے باہر نکال کر زندگی کا ترجمان بنا دیا۔ ادب کو ایک فکری آہنگ و شعور عطا کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس تحریک سے قبل کا ادب فکر و شعور سے معرا تھا یا اس میں زندگی کی رمق و خوبو نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا کلاسیکی ادب ان خوبیوں اور خصلتوں سے مالا مال تھا بس اگر فرق تھا تو اتنا کہ ہمارے قدما کے یہاں جو انسانی و اخلاقی قدروں کی عکاسی ملتی ہے وہ انفرادی حیثیت کی حامل تھی۔ ان کے یہاں اجتماعیت کا فقدان تھا یعنی انھوں نے جو کچھ تحریر کیا تھا یا تحریر کر رہے تھے اس میں ان کا ذاتی کرب یا مشاہدہ جھلکتا تھا۔ ان کے یہاں ظلم کے خلاف احتجاج تو ملتا ہے مگر ظالم کے خلاف آواز نہ کے برابر سنائی پڑتی ہے۔ اجتماعی طور پر ادیب و شاعر کسی ایک نقطہ پر غور و فکر نہیں کیا کرتے تھے۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین نے اس سے انحراف کیا اور اجتماعی طور پر دنیا و سماج کے موجودہ مسائل کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ادب کو مقصدیت و افادیت کا آلہ بنایا اور یہ دکھایا کہ تخلیق صرف حظ یا لطف کے

لئے ہی نہیں ہوتی بلکہ ادیب و شاعر اپنے علم و دانش سے عوام کی رہنمائی بھی کر سکتے ہیں۔ عوام کی سرپرستی بھی کر سکتے ہیں اور ظلم و ظالم کی مخالفت اور مزاحمت بھی۔ پھر بھی اجتماعیت کا خیال اور مقصدیت و افادیت کی یہ باتیں خلاء میں پیدا نہیں ہوئیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا کے حالات ہی ایسے تھے کہ ایسے خیالات و افکار پیدا ہونے لازمی تھے۔ ظلم و تشدد، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا دبدبہ، حکومتوں کا جارحانہ اور غیر منصفانہ نظام کچھ ایسے عالمی اور سماجی اسباب بن چکے تھے کہ اس سے ہر باشعور غیر مطمئن تھا، خواہ وہ کسان ہو، مزدور ہو، ادیب ہو، شاعر ہو، فنکار ہو، فلسفی ہو یا پھر کوئی عام آدمی۔

منشی پریم چند نے پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں جو اپنا تاریخی صدارتی خطبہ پڑھا تھا اس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> "یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ ترقی پسندی ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ ہندوستان کی ہر زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالاتِ روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جابجا اس کے اکھوے بھی نکلنے لگے ہیں، اس کی آبیاری کرنا اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔" [1]

لوگ ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کو اپنے خیال کے مطابق پاکر اس سے متاثر ہوتے گئے۔ اس لئے ہر ذی شعور اور دنیا و سماج سے محبت رکھنے والا انسان اس سے وابستہ ہونے لگا۔ منظر اعظمی نے تحریک کے مسلک و مقصد کے متعلق لکھا ہے کہ:

> "اس تحریک سے ہر وہ شخص وابستگی محسوس کرنے لگا جو کسی نہ کسی جہت سے سماج، سیاست، مذہب اور ادب کے پرانے نظام فکر سے باغی تھا۔ اس کی رو بغاوت آہنگ تھی۔ دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی و عوامی انقلاب تھا۔ اگرچہ اس تحریک نے اپنا

رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا مگر بہت جلد یہ
بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی انقلاب
تھا اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت کی نقیب بن گئی۔'' ۲۷

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منظر اعظمی کے خیال میں یہ تحریک بغاوت آہنگ تھی اور انقلاب برپا کرنا چاہتی تھی، یہ کسی حد تک درست بھی ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ ''اس کا اصل مقصد اشتراکی انقلاب تھا اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت کی نقیب تھی'' گمراہ کن اور غلط ہے۔ منظر اعظمی کا یہ فیصلہ جلد بازی میں لیا گیا ہے۔ اگر وہ تحریک سے وابستہ مصنفین کو بغور دیکھیں اور تحریک کے نشیب و فراز پر نظر ڈالیں پھر تقسیم ہند کے بعد بدلتے ہوئے حالات پر تنقیدی نظر ڈالیں تو شاید انھیں خود اس کا احساس ہو کہ آیا یہ تحریک اشتراکیت سے متاثر تھی مگر اس کا نصب العین کبھی بھی اشتراکی انقلاب برپا کرنا نہیں تھا۔ جیسا کہ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس میں واضح ہوا کہ جب انجمن کو کمیونسٹ پارٹی سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تو تنظیم و تحریک کی حالت یکسر سقیم ہوگئی اور مجبوراً ۱۹۵۳ء کی چھٹی کل ہند کانفرنس میں بھیمڑی منشور کو بالکل رد کر دیا گیا۔ اگر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے (جس کو دنیا ادب برائے ادب کہتی ہے) تو یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ تحریک ادب سے زیادہ تبدیلی سماج و نظام کی حامی تھی۔ مگر یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک ادب برائے ادب کی ہمنوا نہ تھی بلکہ اس کا نعرہ ادب برائے زندگی تھا۔ تو ایسے میں اوپر کہی گئی بات جو کہ الزام کی شکل میں ہے اس تحریک کے بالکل موافق ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت جو نظام تھا، جو سماجی ڈھانچہ تھا وہ بہت حد تک فرسودہ تھا یا پھر فرسودگی کی طرف مائل تھا۔ ایسے میں سماج، سیاست اور ادب میں انقلاب برپا کرنا نہایت ضروری اور اہم کام تھا، جس کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس مقصد کا واضح اشارہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اعلان نامہ میں باقاعدہ ملتا ہے جو کہ پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں ۱۰ار

اپریل ۱۹۳۶ء کو منظور کیا گیا۔ اس کے مطابق:

''ہم ہندستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردعمل کے آثار پائیں گے انہیں افشاں کریں گے۔ ہم انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبات کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے اور یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔'' [۳]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کس سمت جانا چاہتی تھی اور وہ ادب سے کیا کام لینا چاہ رہی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ تحریک کے بانیان میں سے زیادہ تر اشتراکیت کے حامی تھے مگر انھوں نے کبھی بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کو اپنے نظریہ سے مرعوب یا متاثر نہیں کیا۔ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس میں جب انجمن کو پوری طرح سے کمیونسٹ پارٹی کے طابع کرنے کی زبردست کوشش کی گئی اور اس قسم کا منشور بھی منظور کر لیا گیا تو بھی جانتے ہیں کہ یہیں سے تنظیم و تحریک انتشار کا شکار بھی ہو گئی اور انجمن سے ملحق بہت سے معمر اور مستند ادیب و شاعر علیحدہ ہو گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین پر کبھی بھی کمیونسٹ پارٹی کا غلبہ نہیں رہا یا اشتراکی نظریہ حاوی نہیں ہو پایا۔ بھیمڑی منشور کو چھوڑ دیا جائے تو کہیں بھی انجمن کے دستور میں یہ بات نہیں کہی گئی کہ صرف اشتراکی خیال رکھنے والا ہی انجمن کا ممبر بن سکتا ہے۔ (حتیٰ کہ بھیمڑی کانفرنس کے منشور میں بھی یہ بات تحریری شکل میں نہیں کہی گئی تھی) خود سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ:

''یہ بات واضح کی گئی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک جمہوری جماعت ہے اور اس کا طریقہ کار جمہوری ہے۔ اس کے

اعلان نامہ کے مسودے پر ایک سال تک بحث ہوتی رہی اور جب اس سے متفق ہو کر بہت سے لوگوں نے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے، اس کے بعد بھی وہ مسودہ انجمن کا باقاعدہ اعلان نامہ اس وقت بنایا گیا جب کہ سارے ملک سے آئے ہوئے نمائندوں نے ایک کھلی کانفرنس میں اسے منظور کر لیا۔ اس اعلان نامے کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے منظور کر لینے کے بعد (جو انجمن کے اک رکن کے لئے لازمی ہے) یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنے تمام دوسرے عقائد اور تصورات سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیتا ہے، اس اعلان نامے کا لب لباب دو لفظوں میں آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی ہے۔ حیات انسانی کے نمو اور ترقی سے لگاؤ ہے۔ اس کم از کم شرط کو ماننا اس کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ادیب بیک وقت وطن کی آزادی اور جمہوریت کا مخالف اور ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ آزادی خواہ اور جمہوریت پسند ہے تو اس کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے وہ ہندو مت یا اسلام کے مذہبی تصور کو اپنائے، چاہے افلاطونی فلسفہ کو صحیح مانے، چاہے تصوف اور بھگتی کو، چاہے مارکس کی جدلی مادیت کو، چاہے گوتم بدھ کے نروان کے تصور کو، یا مہاتما گاندھی کی اہنسائیت کو، اسے اختیار ہے کہ اپنی ادبی کاوشوں میں وہ ان میں کسی بھی یا ان کے علاوہ کسی اور فلسفہ اور عقیدے کی ترویج و تبلیغ کرے۔'' ؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک کی شروعات میں انجمن کے اغراض و مقاصد صرف وطنی آزادی، جمہوریت پسندی اور فرسودہ سماج میں تبدیلی لانے کی کوشش تھی۔ اس کے لئے کوئی بھی نظریہ پابند یا عائد نہیں کیا گیا تھا۔ جو ادیب یا شاعر ان بنیادی باتوں پر

یقین رکھتا ہو اور عملی تعاون کے لئے راضی ہو وہ مع اپنے عقائد کے انجمن کے ساتھ منسلک ہو سکتا تھا۔ مگر یہ بات کہنے میں جتنی آسان تھی عملی طور پر اتنی ہی مشکل بھی۔ خود ترقی پسندوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا اسی لئے سجاد ظہیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"یہ معاملہ یہاں پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ مثلاً اگر کوئی لیکھک منو اسمرتی کا حوالہ دے کر ذات پات کی وحشیانہ تفریق کو آج بھی صحیح مانتا ہے اور اپنی تحریر میں ان تصورات کی ترویج کرتا ہے، یا کوئی دوسرا شاعر اسلام کا نام لے کر اس ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی فرقوں کے مابین نفرت پھیلاتا ہے تو کیا ترقی پسند ادیب یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہ باتیں اس شخص کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں جس پر قائم رہنے کا اسے پورا اختیار ہے۔ اس لئے ایسے ادیبوں کو بھی ترقی پسندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہمیں لوگوں کے عقائد، خیالات اور عمل کو ان کی مجرد اور خیالی شکل میں نہیں بلکہ اس طرح جانچنا ہو گا کہ ہمارے موجودہ معاشرتی مسائل پر ایک خاص خیال یا فنی تخلیق کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر کسی مصنف کی تخلیق سے زندگی نکھرتی اور سنورتی ہے، انسان کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے، دماغ میں روشنی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے تو پھر چاہے یہ باتیں ہم میں سے کسی کے نزدیک تھوڑی اور ادھوری ہی کیوں نہ ہوں، چاہے ان کے اظہار و بیان میں پختگی نہ ہو اور ہم میں بعض کو ان سے مکمل تسکین بھی نہ ہو اور بہت سی باتوں میں ہمارا اس کا اختلاف ہو، ایسا مصنف ہمارے قبیلے میں سے ہے۔ گو کہ اسے خود کسی سبب سے اس کا اعتراف یا اعلان کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہو۔" [5]

اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو انجمن ترقی پسند مصنفین اپنا واضح فکر و شعور رکھتی تھی اور وہ فکر کے اعتبار سے انتہا پسند نہیں تھی جیسا کہ اس پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ تحریک اشتراکیت کی علمبردار اور اس کی نقیب تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت انسانیت، محبت، اخوت اور مساوات کے لئے اشتراکی نقطہ نظر یا یہ کہیں کہ اشتراکی پارٹیاں جدوجہد کر رہی تھیں اور یہی کام انجمن اپنی تحریک کے ذریعہ لینا چاہتی تھی۔ جس کی وجہ سے انجمن پر کیمونسٹ نواز ہونے کا الزام لگا۔ حالانکہ انسانیت، محبت، اخوت اور مساوات اشتراکیت کی اپج نہیں ہیں بلکہ تمام مذاہب میں ان سب کی اہمیت و افادیت پر زور دیا گیا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کیا گیا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اپنی مقبولیت سے کہیں اور زیادہ مقبول اور پائدار ہوتی اگر اس نے اپنے فکر و شعور میں عملی وسعت اور اعتدال بھی روا رکھی ہوتی۔ اپنی ہزار خوبیوں کے باوجود کچھ انتہا پسندوں نے مغربی علم کے زعم میں آکر اور اشتراکی نقطہ نظر سے مرعوب ہو کر جس طرح سے مذہب و ملت، قدیم ادب اور دیگر امور پر حملے کئے وہ کسی بھی زاویہ سے عدل و انصاف پر مبنی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کے افکار میں تیزی و ترشی بھی ہوتی تھی اور جزو کو کل پر محیط کر دینے کی جذباتیت بھی جس کی وجہ سے انجمن کے مقصد و عمل سے اتفاق رکھنے والے بھی کترا کر چلنے لگے۔ رشید احمد صدیقی اور نواب جعفر علی خاں اثر وغیرہ کا شمار ایسے ہی ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ تحریک کے اغراض و مقاصد کو سمجھتے تھے، اسے سراہتے تھے مگر ان لوگوں کے جو مباحثے اور مکالمے ترقی پسندوں کے ساتھ ہوئے وہ انہیں انتہا پسندانہ انداز اور جذباتی رویوں کی وجہ سے ہوئے۔ یا پھر یہ کہ ترقی پسندوں کے نام یہ الزام بھی تھا کہ یہ لوگ مقصدیت کو فن پر فوقیت دیتے ہیں، ادب میں نعرہ بازی کرتے ہیں اور کلاسیکی ادب کو رجعت پرستانہ ثابت کرتے ہوئے اسے اچھے ادب کے زمرے سے خارج کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان الزامات کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بالکل بے بنیاد تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ پوری طرح سے نہ صحیح مگر جزوی طور

پر یہ باتیں ترقی پسندوں میں پائی جاتی تھیں اور کچھ مخالفین کی اڑائی ہوئی تھیں۔ ہم یہاں پر ان لوگوں کی بات نہیں کرتے جو ادب کو محض تسکین نفس کے لئے روا جانتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ادب کو زندگی اور سماج کا ترجمان مانا ہی نہیں۔ تو پھر ایسے لوگوں کی مخالفت اور اعتراض کا جواب دینا ترقی پسندوں کے نزدیک کوئی ضروری نہیں تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں نے تو ان کا جواب دیا جو ادب اور سماج میں سنجیدہ اور معتبر مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں 'مداوا' میں شائع مضامین کا ذکر کرنا غیر ضروری نہ ہوگا جس میں لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے محض رشید احمد صدیقی کے شکوک وشبہات کو دور کرتے ہوئے ان کے جواب دیے۔ جعفر علی خان اثر نے مارچ ۱۹۴۰ء کے 'نیا ادب' میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان 'نیا ادب کدھر جا رہا ہے' تھا۔ انھوں نے اس مضمون میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو کٹگھرے میں کھڑا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ترقی پسند ادیب پوری طرح سے اشتراکی نظام کے قائل اور تابع ہیں اور یہ لوگ ادب کے ذریعہ اشتراکی رجحان کی ہی ترویج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے الزامات کچھ اس طرح تھے کہ:

"۱۔ اشتراکی نظریہ یہ ہے کہ دولت کی ناہموار تقسیم کا واحد علاج یہ ہے کہ ایک سے چھین کر دوسرے کو دے دی جائے"۔

۲۔ اشتراکی 'دولت کی مساوی تقسیم' کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ اشتراکی ادیب' عفریت میرت انقلاب' کی پرستش کرتے ہیں۔' جس کا اہم مشغلہ سرمایہ داروں کو کچا چبا کر ان کا روپیہ پیسہ مٹھی بھر بھر کے مزدوروں کی طرف پھینکنا اور خود قلقاریاں مارتے ہوئے آگے نکل جانا ہے۔'

۴۔ اس ادب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اخلاق سوز حرکت اور فعل ایسا نہیں جس سے سرمایہ دار کا دامن پاک

ہو اور اس کے علی الرغم فرشتہ اگر انسان کے بھیس میں ظاہر ہو تو مزدور ہوگا۔"

۵۔ اشتراکی ادیب ادب کو براہ راست انقلاب کا آلہ بنانا چاہتے ہیں وہ بغض و عناد کی بنیاد ڈالتے ہیں اور انتقام کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ نیا ادب کی نظمیں نفرت خیز و اشتعال انگیز ہیں اور مزدور کی زندگی یا افلاس کا صرف تاریک رخ دکھاتی ہیں۔"[۲]

یہ الزامات سجاد ظہیر نے اپنے مضمون "سراج مبین" میں نقل کیے ہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جس کے ذریعہ بانی تحریک نے اثر صاحب کو جوابات دیے ہیں، ان کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہا ہے کہ ترقی پسند ادیب اس الزامات کے حامل نہیں ہیں اور یہ کہ اثر صاحب کے خیالات مفروضے اور غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ یہ مضمون اکتوبر ۱۹۴۰ء کے "نیا ادب اور کلیم" میں شائع ہوا تھا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں :

"اثر صاحب ایسے سماج کو خیال میں بھی نہیں لا سکتے جہاں سرمایہ دار ناپید ہوں، آپ مزدور اور سرمایہ دار کو لازم و ملزوم بتاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ واقف نہیں کہ دنیا کے ایک چھٹے حصہ سے بیس برس سے زیادہ ہو گئے، سرمایہ دار، جاگیر دار، سود خور اور ان کے حالی موالی سب غائب ہو گئے۔ ان حضرات کے نابود و ناپید ہونے کے بعد سے زمین کے اس ٹکڑے میں بے روز گاری بالکل باقی نہ رہی، تعلیم جو انقلاب کے پہلے سولہ فیصدی سے زیادہ نہ تھی، اب سو فیصدی ہے، مزدوروں اور کسانوں کی آمدنیاں سال بہ سال بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ علم و فن، ادب اور سائنس ترقی کر رہے ہیں، اس مملکت کی رہنے والی مختلف عوام و مختلف مذاہب

میں تنازع و تنفر باقی نہیں رہا۔" ۷؎

سجاد ظہیر نے اس مضمون میں اشتراکی نظام کی وکالت کرتے ہوئے نواب جعفر علی خان اثر کو قائل کرنا چاہا اور کہا کہ انھوں نے اپنی کم علمی کے باعث اشتراکیوں ہترقی پسندوں پر الزام عائد کئے ہیں، حتیٰ کہ سجاد ظہیر نے اثر صاحب کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے اپنی بات وضاحت سے کہنی چاہی مگر حق یہ ہے کہ وہ راستے سے بھٹک گئے اور بجائے منطق کے جذبات کے تابع ہو گئے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جب 'مداوا' میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کچھ ایسے ہی اشارے ترقی پسندوں کے خلاف کئے تب بھی سجاد ظہیر اپنا منطقی نظر سامنے نہیں رکھ سکے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انھوں نے اپنی اور تحریک کی صفائی میں ترقی پسند مصنفین کو کچھ تنبیہات کیں۔ پھر یہ بھی کہا کہ یہ ساری باتیں مجموعی طور پر سارے ترقی پسندوں پر اطلاق نہیں کرتیں اور نہ ہی انجمن کے دستور یا اعلان نامہ میں انہیں جگہ دی گئی ہے۔ ہاں اگر کچھ انتہا پسند ایسا کرتے ہیں تو انھیں باز آنا چاہئے۔ ''مداوا'' میں ترقی پسندی پر جو الزام سب سے زیادہ زور شور سے لگایا گیا تھا وہ فحاشی سے متعلق تھا۔ جب حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اسی کے مداوے میں وہاں پر فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی۔ جو کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک بہتر قدم تھا۔ لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قرارداد واپس لے لی گئی کیونکہ مولانا حسرت موہانی اس کو ہو بہو منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ تو رہی انجمن پر اشتراکیت نواز ہونے والی بات، جو کہ تحریک کے آغاز سے ہی اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ جب ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم میں افراتفری کا ماحول تھا۔ کہیں پر فاشزم کا قہر تھا (یورپ) تو کہیں پر انگریزی حکمرانوں کا (ہندوستان)۔ اس کے علاوہ سماجی و اقتصادی انتشار نے انسانی قدروں کو پامال کر دیا تھا۔ لوگ پستی کی طرف

مائل ہو رہے تھے۔ ایسے میں ہر ادیب و شاعر، فنکار اور دانشور اس فکر میں تھا کہ کوئی پلیٹ فارم ملے اور ہم سب اس پر اکٹھے ہو کر ان حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سجاد ظہیر نے لندن سے اعلان نامہ ہندوستان بھیجا تو بہتوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آگے چل کر بزرگ اور سنجیدہ ادیبوں نے اتفاق کرتے ہوئے اس انجمن کی سرپرستی قبول کی۔ جن میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، نیاز فتح پوری اور دیگر بہت سے لوگوں کے نام شامل ہیں۔

منشی پریم چند نے جو صدارتی خطبہ پیش کیا تھا وہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اور جیسا کہ انھوں نے اس کا عنوان 'ادب کی غرض و غایت' قائم کیا تھا، یہ خطبہ بالکل اسم با مسمیٰ ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب سے جو کام لینا چاہا تھا، انجمن کے جو اغراض و مقاصد تھے، اس کی توضیح و تشریح اس خطبہ میں پوری طرح سے سمٹ آئی تھی۔ درحقیقت یہ خطبہ جتنا اس وقت اہم تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے لئے مشعل ہے اور جب بھی تحریک پر ادبی حوالے سے انگلی اٹھے گی یہ خطبہ الزام سے پشت پناہی کرتا رہے گا۔

پریم چند کے خطبے کے بعد مولوی عبدالحق کا خطبہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ خطبہ الہ آباد کی ۱۹۳۸ء کی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا جس میں بذات خود مولوی عبدالحق موجود تو نہ تھے مگر ان کا تحریری پیغام لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا جس نے ترقی پسند تحریک کی افادیت اور ضرورت کو اور مسلم کر دیا۔ اس خطبہ میں مولوی عبدالحق نے تحریک کا خیر مقدم کرتے ہوئے ترقی پسند مصنفین کو زبردست تنبیہ بھی کی اور کہا کہ آپ قدیم ادب کو اور قدماء کو نظر انداز کر کے یا انھیں یکسر رد کر کے کوئی بہتر کام انجام نہیں دے سکتے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ قدماء سے مستفیض ہوتے ہوئے اور اپنی تخلیق میں ادبیت کو برتتے ہوئے اپنے مقاصد کو بروئے کار لائیں۔ اس سے عام قاری بھی آپ کے ساتھ ہوگا اور وہ لطف لے کر آپ کی نصیحت کو ماننے کے لئے مجبور بھی ہوگا۔ اس کے علاوہ بنگالی زبان کے معروف ادیب و شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی حمایت بھی تحریک کے لئے فال نیک ثابت ہوئی۔ ٹیگور کا یہ اعتراف کہ

تخلیق وتنقید تنہائی میں کارگر نہیں ہو سکتی انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے کو تقویت بخشی ہے۔ ٹیگور نے کہا تھا کہ میں نے گوشہ نشینی اختیار کر کے اس بات کو پوری طرح سے سمجھ لیا ہے کہ ہماری تخلیق سماج کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتی اور نہ ہی لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ۱۹۳۸ء کی دوسری کل ہند کانفرنس میں ہی سب سے پہلے مجلس صدارت بنانے کا رواج قائم کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسوں میں مختلف زبانوں کے ادیب وشاعر جمع ہوتے تھے اور ان کانفرنسوں میں ادب کے مختلف شعبوں پر مقالے پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں لہٰذا یہ ضروری تھا کہ زبان اور ادب کی مختلف اصناف کے ماہرین ان جلسوں کی صدارت کریں۔ اسی کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ انجمن اپنا رسالہ جاری کرے گی جس میں ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادب کے انتخابات شائع کئے جائیں گے۔ جس سے ہندستانی سماج میں رونما ہونے والے حالات سے سبھی لوگ متعارف ہو سکیں۔ ایک سال بعد ہی ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ایسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سامنے جنگ کو لے کر بھی مسئلہ درپیش تھا کہ وہ جنگ کی حمایت ومخالفت میں کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ انجمن نے ادب کو براہ راست سماج اور سیاست سے جوڑنا چاہا تھا ایسے میں اس جنگ کے اثرات سے عوام کا متاثر ہونا ناگزیر تھا اور انجمن کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کی رہنمائی کرے۔ اسی درمیان سجاد ظہیر جیل سے رہا ہوئے اور جنگ کے متعلق پالیسی طے کرنے کے لئے ایک کل ہند کانفرنس کی ضرورت محسوس کی۔ یہ تیسری کل ہند کانفرنس تھی۔ ابھی تک غیر ترقی پسند ادیب وشاعر عملی اور نظریاتی سطح پر ترقی پسندوں سے بدظن تھے۔ مگر جنگ کی پالیسی کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ باشعور طبقہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرے اور انجمن کا معاون ومددگار رہے۔ لیکن ایسا ہونا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ جب تیسری کل ہند کانفرنس کے دعوت نامے ارسال ہوئے تو یہ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ سے جاری کئے

گئے۔ دہلی سے جاری دعوت نامے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اس میں انجمن کے اغراض ومقاصد کا حوالہ دیا گیا تھا جن جن کے پاس یہ دعوت نامہ پہنچا انھوں نے یہی قیاس کیا کہ یہ دعوت نامہ کسی عام مصنفین کی کانفرنس کے لئے ہے جبکہ لکھنؤ سے بھیجے گئے دعوت نامے انجمن کی طرف سے تھے اور ترقی پسند مصنفین اس کانفرنس کو اپنی سمجھ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کانفرنس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں فکر کے ادیب وشاعر ودانشور یکجا ہو گئے اور جنگ کے مسئلہ پر کارآمد بحث ہوگئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کو بیشتر پسند کیا جاتا تھا مگر ان کے طریقۂ کار سے اکثر اختلافات کی گنجائش بنی رہتی تھی۔ جب بھیمڑی کانفرنس (۱۹۳۹ء) ہوئی اور اس میں اشتراکی نظریہ کو انجمن کا ذاتی منشور تسلیم کر لیا گیا تو بہت سے سنجیدہ اور معتبر لکھنے والوں نے انجمن سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہ انجمن کی انتہا پسندی تھی جس نے انتشار پیدا کرنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے اشتراکی نظریہ کو براہ راست اپنی تخلیقات میں پرونا نہیں چاہا انھیں نیم ترقی پسند یا رجعت پسند کہا جانے لگا۔ حتیٰ کہ فیض احمد فیض پر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں۔ لیکن بہت جلد یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کوئی سیاسی انجمن نہیں ہے اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی کی جز۔ اس لئے ۱۹۵۳ء کی چھٹی کانفرنس میں لوگوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پھر سے تنظیم وتحریک میں واپس آجائیں اور اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ عوام کو مستفیض کریں اور انجمن کے اغراض ومقاصد میں عملی وسعت پیدا کریں۔ ماہنامہ 'شاہراہ' میں جولائی ۱۹۵۳ء سے لے کر دسمبر ۱۹۵۳ء تک راجندر سنگھ بیدی، مخدوم محی الدین، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے نام کھلی چٹھیاں شائع کی گئیں اور ان سے لکھنے کا مطالبہ کیا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی کے نام جو کھلی چٹھی لکھی گئی وہ جولائی ۱۹۵۳ء کے شمارہ میں صفحہ ۶۵ پر چھپی۔ جس میں لکھا گیا کہ:

"پیارے ساتھی!

اردو کے افسانوی ادب پر جب نظر پڑتی ہے تو آپ کا نام

آج بھی سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے اردو کو بیسیوں بے نظیر افسانے دیئے ہیں۔ افسانہ صحیح معنوں میں آپ ہی کے یہاں ملتا ہے۔ آپ کے افسانوں میں ہمارے آنسو ہیں، قہقہے ہیں، جذبے، ولولے اور امیدیں ہیں۔ ان میں روشن مستقبل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ایک عالمگیر محبت کی سوندھی سوندھی خوشبو ان سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اردو افسانے کو آپ نے ترقی یافتہ افسانوں کے برابر لا کھڑا کیا ہے لیکن آپ آٹھ سال سے خاموش ہیں۔

ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ سکوت مصلحت اندیش ہے کہ طوفان سے پہلے کا سناٹا۔ ویسے بھی جی یہ چاہتا ہے کہ اسے طوفان کے پہلے کا سناٹا تسلیم کیا جائے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ آپ اپنی خاموشی سے مطمئن ہیں۔ اپنی اس خاموشی پر بھی ضرور جھنجلاتے ہوں گے۔ ہر ایک فنکار اور تخلیقی کام کرنے والے پر ایسا موڈ طاری ہوتا ہے۔ لیکن اس موڈ کی عمر اتنی لمبی نہیں ہوتی۔ آپ کے تعطل کی طوالت ادب دوستوں کو بری طرح کھلتی ہے۔ آپ کی خاموشی کو یاسیت یا پھر تیاگ سے ہم بھی تعبیر نہیں کر سکتے۔ فلمی ماحول ہر چند، کان نمک سہی لیکن ہمیں ابھی تک آپ کے نمک بن جانے میں شبہ ہے، فلمی ماحول سے آپ بیزاری کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر جو فنکار ہے وہ ابھی تک زندہ ہے اور آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ فلمی صنعت میں کسی ادیب کی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھ سکتی۔

آپ کی خاموشی سے آپ کا ذاتی نقصان ہوتا تو شاید ہمیں اتنی فکر نہ ہوتی لیکن اس سے ہمارے افسانوی ادب کو نقصان

پہنچ رہا ہے جو قوم اور وطن کا نقصان ہے۔ آج جب کہ رجعت پرست ادب کا احیاء زوروں پر ہے آپ کی خاموشی مضر ثابت ہو رہی ہے۔ جب سے آپ نے افسانہ نگاری سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اس وقت سے ہمارے افسانے میں چند ایک غلط رجحانات پرورش پا رہے ہیں اور یہ غلط رجحانات نئی پود کی تخلیقات میں داخل ہو چکے ہیں اور اس طرح افسانے کی صورت مسخ ہو رہی ہے۔ ہم آپ سے ادب کی طرف لوٹ آنے کی اپیل کرتے ہیں۔ جب ٹالسٹائی نے کچھ عرصہ کے لئے لکھنا بند کر دیا تھا تو تورگنیف نے ٹالسٹائی کو درد بھرا خط لکھا تھا اور ٹالسٹائی نے تورگنیف کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ ہم تورگنیف نہیں ہیں لیکن یہ خواہش ضرور رکھتے ہیں کہ ہماری التجا آپ کے ہاں بار پائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی کے دور میں آپ اور آپ کے بچے فاقہ کشی پر مجبور ہوں۔ لیکن یہ تمنا بھی ضرور رکھتے ہیں کہ آپ عظیم آرٹسٹ وان گاگ کی طرح آرٹ کی تخلیق کریں جس نے اقتصادی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے عظیم آرٹ پیش کیا۔"

اس خط پر مخمور جالندھری، شرر فتح پوری، نریش کمار شاد، انور عظیم، پرکاش پنڈت، ہنس راج رہبر، تاجور سامری، ظفر پیامی، اور غلام ربانی تاباں کے دستخط تھے۔ نومبر ۱۹۵۳ء کے شاہراہ میں صفحہ ۶۲ پر مخدوم محی الدین کے نام ایک خط شائع کیا گیا جس میں لکھا گیا کہ:

"پیارے ساتھی

۱۹۳۰ء کی بات ہے اردو شاعری میں وسیع پیمانے پر موضوع اور ہیئت کے تجربے ہو رہے تھے۔ جدت آفرینی کے روپ میں خلط ملط قسم کے رجحانات ہمارے ادب میں داخل ہو

رہے تھے۔ اور اس جدت آفرینی، بے راہروی اور روایات دشمنی کو ترقی پسند کہہ کر بڑی شدومد سے اچھالا جا رہا تھا لیکن آپ ہمارے گنے چنے ساتھیوں کے ساتھ اس وقت بھی ادب میں صحیح سمت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ آپ کی طبع زاد نظم "اندھیرا" جبول جابر کی نظم کا ترجمہ اور گیت "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" آج بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے۔

آپ کی صحت مند اور جاندار تخلیقی قوت سے ہمیں ایسے بیسیوں شہ پاروں کی توقع تھی کہ آپ یک بیک فرقہ پرستی اور جاگیردارانہ استبداد کے خلاف ان محنت کشوں کی صفوں میں جا پہنچے جو انقلاب کو فتح مند بناتے ہیں اور جن کے دکھ درد، عزم و یقین اور جدو جہد کی آپ اپنی نظموں میں آئینہ داری کر رہے تھے۔ آپ کے دور افتادہ ساتھی جب بھی اخباروں میں آپ سے متعلق خبریں پڑھتے تو ان کا دل بلیوں اچھلنے لگتا کیوں کہ آپ ثابت کر رہے تھے کہ ادیب نہ صرف انسانوں کی روح کے انجینیر ہوتے ہیں بلکہ جہد و عمل کے لئے صف آرا، عوام کے دوش بدوش کڑی اور منصفانہ جنگ بھی لڑتے ہیں۔ ہم جہاں آپ پر فخر کرتے وہاں ہمیں آپ پر رشک بھی آتا اور اپنی بیکسی اور لاچاری سے نفرت بھی ہوتی کہ ہم آپ کی پیروی کیوں نہیں کر پاتے۔ ہم اس وقت آپ سے ادبی تخلیقات کا مطالبہ نہیں کر سکتے کیوں کہ آپ ادب کی تخلیق سے کہیں بہتر فرض سرانجام دے رہے تھے۔ تلنگانہ اور مخدوم ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے۔

آپ اگرچہ آج بھی عظیم عوامی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں لیکن آج ہم آپ سے مطالبہ کریں گے کہ آپ ادب

سے روگردانی نہ کیجئے۔ آپ کو محنت کش عوام کی قربت حاصل رہی ہے۔ ان گنت محنت کش ہیرو (مثبت انسان) آپ کی نظر سے گزرے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عوام سے کٹے ہوئے تحریکوں سے باہر ادیب ہمارے سماج سے ابھرتے ہوئے نئے انسانوں کے کردار کو اپنی تخلیقات میں مسخ کر رہے ہیں، اس لئے آپ کو ادبی تخلیقات پر پھر سے مائل کرنے کا ہمارا مطالبہ اور بھی پُر زور ہوتا جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے عظیم اور ثروت مند عوامی تجربات کی بنیاد پر رچا ہوا اور جلا پایا ہوا ادب پیش کریں۔ شعلہ ریز، ہمت افروز اور حقائق آمیز نظمیں کہیں تاکہ ہمارا ادب بہت سے الزامات سے محفوظ رہے اور ہم بھی کہہ سکیں کہ ہمارے یہاں بھی انسان دوست، حقیقت پسند اور قد آور ادب کی کمی نہیں۔"

اس خط پر شرر فتح پوری، تاجور سامری، انور عظیم، شہاب جعفری، باقر مہدی، ہنس راج رہبر، بزنیش کمار شاد، ظ انصاری، مخمور جالندھری اور سید الابرار کے دستخط تھے۔ پھر دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے میں صفحہ ۶۱ پر عصمت چغتائی کے نام بھی ایک خط شائع کیا گیا۔ جس میں لکھا گیا:

"محترمہ!

آپ کی افسانہ نویسی کا وہ پہلا دور ہم کو یاد ہے جب آپ نے اپنی کہانیوں اور ڈراموں سے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا ۔ اس زمانے میں ایک بزرگ نے ایک دن کہا کہ یہ عصمت صاحبہ ہیں کون بلا۔ میں ان کے افسانے تو اپنی بیوی کو بھی پڑھنے نہیں دیتا .... یہ عصمت وصمت کوئی نہیں ہے، یہ کوئی مرد ہے۔ کچھ دن بعد

وہی بزرگ اپنے ہر دوست کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہتے پھرتے تھے کہ ارے بھئی یہ عصمت مصنف نہیں ہے سرجن ہے سرجن۔ آپ نے درمیانی طبقہ کی گھریلو روایات اور جاگیرداری نظام کے زوال پذیر دور میں گرتی ہوئی حویلیوں میں محبوس اور سڑی ہوئی جنسی زندگی کی دھجیاں جس صداقت آمیز بیباکانہ اور فنکارانہ انداز میں اڑائی تھیں اس کی آپ پیش رو تھیں۔ مریض سوسائٹی کے افراد آپ کی تخلیقات گھروں میں بیٹھ کر اور لطف لے لے کر پڑھتے تھے۔ اور باہر نکل کر آپ کو گالیاں دیتے تھے۔ یہ آپ کے اپنے آرٹ اور اسلوب بیان کا جادو تھا۔ تعلیمی اداروں میں لڑکے اور لڑکیوں کی باہم زندگی سے آپ نے جو کہانیاں نکالی ہیں وہ بھی آپ اپنی مثال ہیں۔

آپ کہیں گی کہ اس وقت میں نے جو کچھ لکھا فرائڈ اور لارنس کے غیر صحت مند جنسی نظریوں سے متاثر ہو کر لکھا اور جو آج صحت منداور ترقی پسند معیار ادب پر پورا نہیں اترتا۔ تو محترمہ غلط سہی مگر اس دور کا رجحان ہی یہی تھا اور تقریباً تمام ترقی پسند ادیب اسی کو ترقی پسندی سمجھ بیٹھے تھے۔ آپ تنہا نہ تھیں ایک قافلہ تھا جو غلط راہ پر گامزن تھا۔ مگر چونکہ آپ کا فنی شعور بالغ تھا اور آپ دوررس تھی۔ کچھ دور چل کر آپ نے اپنا راستہ بدل لیا۔ آپ نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر صحیح ترقی پسند اور صحت مند زاویوں سے نگاہ ڈالنا شروع کر دیا۔ آپ نے زندگی کی قدروں کو پرکھا، اور سمجھا پہلے سے کہیں بہتر کہانیاں تخلیق کیں۔ آپ کا آرٹ تو آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہی رہتا تھا آپ نے "دھانی بانک پن" اور "چوتھی کا جوڑا" ایسے

ڈرامے اور امر کہانیاں لکھیں (آپ کے شاہکار کی فہرست طویل ہے) یہ دیکھ کر آپ سے ہماری توقعات بڑھتی گئیں، اس کے بعد آپ فلمی دنیا میں کھو گئیں ...... ہم نے وہاں اپنی محبوب فنکار عصمت کو بہت تلاش کیا مگر وہ اس بھول بھلیا میں کہیں دکھائی نہ دیں.......

اب آپ پھر واپس آ گئیں ہیں اور وطن میں آرام کر رہی ہیں۔ آپ کے پاس وقت ہے، آپ کا آرٹ ہے، آپ کی نظر ہے اور آپ پر ہماری توقعات کا قرضہ بھی چڑھا ہوا ہے اس لئے ہم آپ کو اپنا سمجھ کر آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اپنی تخلیقی قوتوں سے افسانوی ادب کے اس ویران گوشے کو پھر اسی معیار رنگ و نقش سے گلزار بنا دیجئے۔ جس معیار کی داغ بیل آپ نے دوسرے دور میں ڈالی تھی۔ آپ کے پڑھنے والے چشم براہ ہیں۔ فنکار کبھی نہیں مرتا۔"

اس خط پر تاجور سامری، وامق جونپوری، شہاب جعفری، نریش کمار شاد، صدیقہ بیگم، انور عظیم، شرر فتح پوری، حبیب تنویر، غلام ربانی تاباں، اطہر پرویز، مخمور جالندھری، سید الابرار اور حسن نعیم کے دستخط تھے۔ اس کے علاوہ جب تنظیم میں انتشار و جمود پیدا ہوا اور انجمن کے جنرل سکریٹری کرشن چندر بھی ادبی سرگرمیوں سے دور ہو گئے اور تنظیمی امور سے بھی ان کی دلچسپی ختم ہونے لگی تو بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے ان کے نام بھی ایک خط لکھا اور شائع کروا دیا۔ یہ خط ۱۹۵۳ء کے ہی 'شاہراہ' کی جلد ۵ میں صفحہ ۵۷ اور ۵۸ پر شائع ہوا۔

"پیارے ساتھی!

آپ ہمارے مقبول ترین افسانہ نگاروں اور ادیبوں میں سے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں جو شگفتگی، شعریت، تصور کی رنگ آمیزی اور رومان کی چاشنی ہوتی ہے اسے پسند کرنے والوں کا حلقہ

بڑا وسیع ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں سے لکھنے والوں کی نئی پود کو بہت متاثر کیا ہے۔ وہ آپ کے طرز نگارش کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کو اس بھاری ذمہ داری کا احساس دلایا جائے جو آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ اپنے افسانوں، فلمی کہانیوں، فحاشی کو فروغ دینے والے سستے قسم کے رسائل میں اپنے قصوں، کتابوں کے دیباچوں اور مضامین میں جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں یار لوگ انہیں لے اڑتے ہیں۔ اور پھر آپ کے خیالات کو آگے بڑھاتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ آپ سے اگر چوک ہو جائے تو بہت سی غلط باتیں اور رجحانات جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ جن کی قطع وبرید کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آپ کی دیکھا دیکھی دوسرے کچھ ادیب بھی سستے قسم کے رسائل کی پالیسی کے مطابق کہانیاں لکھتے ہیں اور اس کے جواز میں آپ کا حوالہ دیتے ہیں۔

ترقی پسند ادیبوں میں آپ کا مقام بہت اونچا ہے اور یہ مقام آپ نے محنت اور اپنی ذہانت سے حاصل کیا ہے۔ آپ کی ہر دلعزیزی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہمارے دیس کی مختلف زبانوں کے ادیبوں نے آپ سے عقیدت ومحبت کا اکثر اظہار کیا ہے۔ آپ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری بھی ہیں آپ کے ایک ایک جملے کو ادیبوں کی سب سے بڑی اس انجمن کا ترجمان تصور کرلیا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے اس لئے ان پر کیفوں، ریستورانوں، ادبی نشستوں اور ہر اس

جگہ جہاں ادیب، ادب دوست اور سخن فہم جمع ہوتے ہیں گرماگرم بحث کی جاتی ہے۔ پہلے کی نسبت آج لوگوں کا ادبی، سیاسی، سماجی اور نظریاتی شعور بہت ترقی کر چکا ہے۔ انہیں آج آپ سے یہ توقع ہے کہ آپ ان کا نہ صرف ساتھ دیں بلکہ ان کی شعوری رہنمائی بھی کریں۔ آپ کے فن اور موضوع کے بارے میں ہم سے سوالات کئے جاتے ہیں اور وہ ان کا تسلی بخش جواب بھی ہم سے چاہتے ہیں۔ آپ کی حفاظت میں اس وقت ہم ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جب وہ آپ کے افسانوں پر حقائق سے روپوشی، کرداروں کی جذباتیت، واقعات کا تصنع، رومانی مقصدیت اور پلاٹ کی جگہ شاعری اور لفاظی کے اعتراضات کرتے ہیں اور آپ کے ان افسانوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں "ایک ہزار چار سو بہتر لڑکیاں"، "امن کی انگلیاں"، "ایرانی پلاؤ"، "جب کھیت جاگے"، "عورتوں کا عطر"، "ایک دو تین" (فلم) اور "زلزلہ" (فلم)۔

آپ کی عظمت اور سحر نگاری کے ہم قائل ہوتے ہوئے یہ محسوس کر رہے تھے کہ آپ فلمی ماحول کو متاثر کریں گے تاکہ اچھی فلمیں ہمیں میسر آسکیں، لیکن ہوا یہ ہے کہ فلمی ماحول نے آپ کو متاثر کیا ہے اور آپ کی تخلیقی قوت پر ضرب پڑ رہی ہے اور ہمارے ادب کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ آپ جو شہ پارے ہمارے ادب کو دے سکتے ہیں وہ اسے نہیں مل رہے ہیں۔ فلمی ماحول میں رہتے ہوئے اگر آپ اپنی صنف اور اپنے فن کو برقرار رکھ سکتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر آپ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ یہ ماحول آپ کی ذہنی

نشوونما کے لئے ساز گار نہیں تو ہم آپ سے التجا کریں گے کہ پریم چند کی طرح آپ واپس چلے آئیے جہاں آپ ہر ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کو دشواریوں سے تو دوچار ہونا پڑے گا لیکن اس قسم کے ایثار سے ہر ایک عہد آفریں فنکار نے کام لیا ہے۔ آپ کو اپنی مقبولیت پر اعتماد ہونا چاہئے جو آپ کی روزی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل کر سکتی ہے۔ اس طرح کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری ہونے کی حیثیت سے جو فرائض آپ پر عائد ہوتے ہیں انھیں بھی آپ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے۔"

اس خط پر مخمور جالندھری، ہنس راج رہبر، انور عظیم، تاجور سامری، پریتم ناگر پنچھی، سید الابرار، نریش کمار شاد، ہری دت شرما، پرکاش پنڈت، اطہر پرویز، ظفر ادیب، صدیقہ بیگم، غلام ربانی تاباں، انور عباس اور اشفاق وغیرہ کے دستخط تھے۔ ان خطوط سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھیونڈی منشور نے لوگوں کو بہت حد تک بے عمل بنا دیا تھا اور لوگوں نے اپنی بساط تہہ کر لی تھی۔ پھر ان سے لکھنے کے مطالبے بھی ہوتے رہے اور انھیں انجمن و تحریک سے جوڑنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی۔ لیکن اتنا تو ہوا ہی کہ انجمن کے اراکین اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے مصنفین کے درمیان ایک اعتدال قائم نہیں کر سکے۔ مگر یہ جمود بہت دنوں تک طاری نہیں رہ سکا کیونکہ ادیب و شاعر ایک باشعور ذہن بھی رکھتا ہے اور وقت کی ضرورت اسے صحیح سمت میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس سے پہلے ممتاز حسین نے ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق ایک گراں قدر مضمون لکھ کر ادبی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ جس میں انھوں نے ماضی کے ادب پر زبردست حملہ کرتے ہوئے اسے رجعت پرست ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اقبال کو محض اسلامی شاعر قرار دے کر ان کی ادبی حیثیت کو کم کیا تھا۔ ان کے نزدیک اشتراکی اور مادی نظریہ ہی بہتر سائنسی اور عقلی نظریہ تھا۔ ان کے اس مضمون پر کافی بحث ہوئی۔ اس کے علاوہ سجاد ظہیر نے نئے ترقی پسند لکھنے والوں پر قدغن

لگاتے ہوئے کئی مضامین لکھے۔ غلط رجحان ایک ایسا ہی مضمون ہے، جس میں انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کو انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ ادب محض مقصدیت نہیں بلکہ اس میں فنی لوازمات کا ہونا از حد ضروری ہے۔ سجاد ظہیر نے یہ بھی کہا کہ ادیب و شاعر کا کام واعظ دینا نہیں، اور نہ ہی مارکسی یا اشتراکی فلسفہ سمجھانا ہے اس کے لئے بہت ساری کتابیں بازار میں بھری پڑی ہیں۔ ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ اپنی بات حسن اور شعریت کے ساتھ کہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جس طرح بنجر زمین میں بہتر سے بہتر دانے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اسی طرح آپ کی اچھی سے اچھی بات بغیر فن اور ہیئت کے کسی کے دل پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۳۹ء میں مکتبہ شاہراہ نے منتخب ادب کی ایک کتاب شائع کی جس میں ممتاز حسین کا مذکورہ مضمون اور محمد حسن کا مضمون "ادب زندگی اور سماج" شامل تھا، جس میں محمد حسن نے ادب کو زندگی اور سماج کے نظریے سے پرکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

> "اس میں شک نہیں کہ فنکار عوامی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کو کسی طبقہ کی زندگی کی عکاسی تک محدود کر سکتا ہے یا مٹتے ہوئے تمدنوں کی آئینہ برداری کر سکتا ہے"۔ ۵

انھوں نے یہ بھی کہا کہ :

> "زندگی سے عام طور پر سماجی زندگی مراد لی جاتی ہے ظاہر ہے کہ سماجی زندگی مختلف انفرادی زندگیوں سے مرکب ہے۔ مگر وہ صرف انفرادی زندگیوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ انفرادی زندگی دراصل سماجی زندگی کا ایک مظہر ہے اور کسی بھی شخص کی زندگی عام طور پر اسی حد تک قابل توجہ اور دلچسپ ہو سکتی ہے جب تک وہ سماجی زندگی کی روشنی میں سمجھی جا سکے اور جس میں وہ عام انسانی جذبات سے ہم آہنگ ہو۔ پاگل یا مریض انسان کے خیالات اور خواہشات عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ ماہرین نفسیات کے لئے

تو دلچسپ ہو سکتے ہیں مگر ادب کا موضوع نہیں بن سکتے۔ادب میں غیر معمولی اور غیر مجلسی ذہنوں کی تصویریں کھینچی گئی ہیں مگر صرف اسی حد تک جہاں یہ سماجی شعور کی سرحدوں کو چھوتی ہیں اور عام انسانوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔چنانچہ ادب کا بنیادی موضوع انفرادی زندگیوں سے صرف اسی حد تک تعلق رکھتا ہے جہاں تک وہ سماجی شعور کی آئینہ دار ہیں اور اس کے تنوع کو پیش کرتی ہیں۔انفرادیت پرست فنکاروں نے یہ دلیل بار بار پیش کی ہے کہ انفرادی ذہن ہی بالآخر سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی جو صرف اپنی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل زندگی ہی کے عکاس ٹھہرتے ہیں۔'' 9

ڈاکٹر سلامت اللہ نے اپنے ایک مضمون ''ترقی پسندی'' میں لکھا :

''ہندستان کے ادب میں انسان دوستی کی روایات بہت پرانی ہے۔یہاں کلاسیکی ادب میں اور جدید ادب میں بھی انسان دوستی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کا مفہوم ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ہر دور کے سماجی حالات کے مطابق ادب میں انسان دوستی کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔مثال کے طور پر اگر رامائن اور مہابھارت میں اس کا اظہار کسی راجہ کی انصاف پروری،خدا ترسی اور فیاضی کے ذریعہ ہوتا ہے تو موجودہ زمانے میں یہ چیز ہمیں پریم چند جیسے ادیبوں کی ان کہانیوں میں ملتی ہے جہاں وہ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم کی تصویر کھینچتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسان اور مزدور کس طرح دکھ بھری زندگی گزار رہے ہیں۔

ترقی پسند ادب انسان دوستی کی ان تمام روایات کا صحیح

معنوں میں وارث اور امین ہے جنھوں نے انسانی زندگی کو چار چاند لگائے ہیں اور اس کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کیا ہے آج ترقی پسند ادیب جس قسم کے سماجی نظام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ کسی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ انسان ہے۔ اس سرمایے کو فروغ دینے کے لئے ہمیں انسان دوستی کی تمام دیرینہ صفات کو اپنے فن میں سمونا ہوگا لیکن اس فرض سے ہم اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم ان صفات کے مفہوم کو موجودہ حالات کے پس منظر میں متعین نہ کرلیں۔

آج سائنس نے اس حد تک ترقی کر لی ہے اور ٹکنالوجی نے اس قدر فروغ حاصل کرلیا ہے کہ دنیا کے سارے وسائل میں توسیع کے لامحدود امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ آج تمام دنیا کے انسان بہ آسانی خوش حال اور بامہذب زندگی بسر کر سکتے ہیں اور انسانیت ستاروں سے آگے اور جہانوں کے افق کو چھو سکتی ہے لیکن موجودہ سماجی نظام میں یہ چیز اس لئے ممکن نہیں ہے کہ بیشتر ملکوں میں سائنس اور اس کے عمل کو صرف مٹھی بھر لوگ غصب کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ذرائع پیداوار یعنی کارخانہ جات اور زمین پر ان کا قبضہ ہے اور جو لوگ دراصل پیداوار کے خالق ہیں ان کو محض اتنی اجرت ملتی ہے کہ بہ مشکل تمام اپنے جسم اور روح کو ایک ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج محنت کش انسانوں کی اکثریت غیر ضروری طور پر معاشی اور تہذیبی دونوں لحاظ سے بھوکی اور ننگی رہنے پر مجبور ہے۔

آج حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کسان قصہ کہانیوں کو وہ خیالی کیر کٹر نہیں ہے جو اپنی غلامی کی زنجیروں کو سونے کا ہار سمجھ رہا ہے۔

تسلیم و رضا جس کا شیوہ ہے اور جو جہالت میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے
کہ اپنے ذاتی مفاد سے بے خبر ہے۔ آج کا کسان طبقاتی شعور سے
لیس ہو کر جاگیردارانہ نظام کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے۔ اس کا
رہنما آج تلنگانہ کا مجاہد ہے، وہ دلیری کا مظہر ہے نہ کہ بزدلی کا۔ وہ
رجائیت کا نمائندہ ہے نہ کہ یاسیت کا۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنا
بھی انسان دوستی ہے"۔ ۵۱

انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے آپ کو عوام سے جوڑنے کے لئے اور اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے اپنی ایک شاخ بھی بنائی جسے اپٹا IPTA کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی تنظیم تھی جس میں لوک گیت، لوک ناچ، ڈرامہ اور دیگر حرکات وسکنات کے مظاہرے کر کے عوام کے سامنے اپنی بات دل چسپ انداز میں رکھی جاتی تھی۔ اپٹا نے اپنے آپ کو براہ راست عوام سے جوڑا نیز سماجی وسیاسی مسائل کو بڑی باریکی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ کہنے کے لئے تو یہ تنظیم ادبی تنظیم نہیں تھی مگر ادب کی رنگت اور اس کی رعنائی اس تنظیم کی خوبی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر ادیب وشاعر کسی نہ کسی جہت سے اپٹا سے ضرور جڑے ہوئے تھے۔ چاہے وہ گیت کار ہوں، ڈرامہ نگار ہوں، افسانہ نویس ہوں یا خود اداکار اور ہدایت کار۔ اپٹا کا رسالہ "یونیٹی" انجمن کا اپنا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور انجمن کے فکر وشعور کا مبلغ بھی۔ اسی طرح انجمن نے اپنا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جسے "نیا ادب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے کچھ ہی شمارے شائع ہو سکے، بعد میں جوش ملیح آبادی نے اپنا رسالہ "کلیم" بھی اس میں ضم کر دیا اور اب یہ رسالہ "نیا ادب اور کلیم" کے نام سے شائع ہونے لگا۔ نیا ادب کی ادارتی کمیٹی میں سردار جعفری، سبط حسن اور مجاز شامل تھے۔ آگے چل کر سردار جعفری نے رسالہ گفتگو بھی جاری کیا جو انجمن کے مقاصد کا ترجمان تھا۔ رسالوں میں منتخب ترقی پسند ادب شائع ہوا کرتے تھے۔ ان رسائل کے علاوہ ساقی، ادب لطیف، شاہراہ، سویرا، انکار، سنگ میل وغیرہ بھی اس تحریک کی مقبولیت اور

محبوبیت کے ذمہ دار ہیں۔

غرض کہ یہ تحریک اپنے فکروشعور، اپنی افادیت ومقصدیت اور زندگی کی ترجمانی کی بدولت ہندستان کے تقریباً سبھی زبانوں کے ادب میں معروف ومقبول ہوتی گئی۔اس وقت کے حالات نے بھی اس کے لئے سازگار فضا مہیا کی۔سماجی اور سیاسی بحران نے عوام کو اس کے نزدیک کیا اور ترقی پسند مصنفین نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔انھوں نے اپنے ذاتی خیالات اور نفسیات پر عوامی الجھنوں اور ضرورتوں کو ترجیح دی اپنی تخلیق میں ان ساری چیزوں کو موثر طریقے سے پیش کیا۔یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۰ء کے درمیان ہندستان کے اکثر بڑے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہوگیں۔دہلی، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، حیدرآباد، بمبئی، کولکاتا، گیا، بھوپال، احمد آباد وغیرہ میں نہ صرف انجمنیں قائم ہوئیں بلکہ خوب فعال بھی رہیں۔اس کے علاوہ صوبائی انجمنیں بھی بنیں۔جنھوں نے اپنے اپنے صوبے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو زبردست تقویت پہنچائی۔

علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ غالباً سب سے پہلے قائم ہوئی۔اس کا پہلا جلسہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں ہی خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا تھا۔جس میں علی سردار جعفری نے "جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔یہ انجمن ڈاکٹر محمد اشرف کی تحریک پر قائم ہوئی تھی۔اس جلسہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی موجود تھے جو کہ اس وقت علی گڑھ یونی ورسٹی میں عربی کے لکچرر تھے۔علی گڑھ میں سعادت حسن منٹو، علی سردار جعفری، شاہد لطیف، عصمت چغتائی، آل احمد سرور، حبیب الرحمٰن، محسن عبداللہ وغیرہ شرکت کیا کرتے تھے۔یہ جلسے باقاعدہ طور پر خواجہ منظور حسین صاحب کے یہاں ہی ہوتے تھے۔[11]

۱۹۴۳ء میں معین احسن جذبی کی پہل پر اس انجمن کی دوبارہ تشکیل ہوئی۔اس میں جذبی کے علاوہ باقر مہدی، فرید بخش قادری، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، سلامت اللہ خان، مونس رضا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی وغیرہ شریک ہوتے تھے۔یوسف

حسین زیدی انجمن کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری وغیرہ بھی علی گڑھ آتے تو انجمن کے جلسوں میں ضرور شریک ہوتے۔ یوسف حسین کے بعد سلامت اللہ خان جنرل سکریٹری چنے گئے پھر اولاد احمد صدیقی، رشید احمد صدیقی جو کہ ترقی پسند مصنفین کے زبان و بیان سے بہت زیادہ خوش نہیں تھے تاہم وہ ان نوجوان ادیبوں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ ۱۲

لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے پہلی کل ہند کانفرنس منعقد کی۔ اس لئے ضروری تھا کہ یہاں پر بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوتی۔ کیوں کہ اس وقت لکھنؤ میں بہت سے مقتدر ادیب و شاعر جمع تھے۔ رسالہ نیا ادب پہلے پہل لکھنؤ سے ہی جاری ہوا جس کا دفتر حضرت گنج کے پیچھے بھوپال ہاؤس میں تھا۔ لکھنؤ کی اس انجمن کے جلسوں میں ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، سلام مچھلی شہری، انتظار حسین، محمد حسین، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، منظر سلیم، خلیق ابراہیم، قرۃ العین حیدر، مسیح الحسن رضوی، قمر رئیس اور اقبال مجید وغیرہ شامل ہوا کرتے تھے۔ متنازعہ افسانوی مجموعہ 'انگارے' بھی لکھنؤ سے ہی شائع ہوا تھا۔

الہ آباد میں تو انجمن کی بنیاد ہی پڑی۔ جہاں سجاد ظہیر نے پہلے پہل منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، دیانرائن نگم وغیرہ کے دستخط حاصل کئے۔ ان کی حمایت اور شفقت حاصل کی۔ یہاں بھی انجمن کی شاخ قائم ہوئی مگر ذرا دیر سے۔ یہاں پر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، وامق جونپوری، پرکاش چند گپت، راہی معصوم رضا، سمترانندن پنت، مسعود اختر جمال، اجمل اجملی، دشینت کمار، نافع رضوی، فاروق جنوں، نسیم انصاری، دویندر اسر، تیغ الہ آبادی اور سید محمد عقیل رضوی انجمن کے جلسوں کے اہم شرکاء ہوا کرتے تھے۔ ساحر لدھیانوی بھی اکثر و بیشتر جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ نشستیں ہفتہ وارانہ ہوتی تھیں۔ کبھی فراق صاحب کے گھر پر کبھی اعجاز صاحب کے گھر

پر اور کبھی مسعود اختر جمال کے گھر پر۔ ۱۳

حیدر آباد میں انجمن کی باقاعدہ تشکیل جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ اس کے سکریٹری عابد علی خان تھے اور اس کی تشکیل میں سب سے زیادہ ہاتھ مخدوم محی الدین کا رہا۔ اس انجمن کی پہلی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت قاضی عبد الغفار صاحب نے کی۔ یہاں کے جلسوں میں مخدوم محی الدین، نظر حیدر آبادی، حمایت علی شاعر، حسینی شاہد، کلیم اللہ، اختر حسن، مسلم ضیائی، مغنی تبسم، عزیز قیسی، رضیہ اکبر، زینت ساجدہ، رابعہ برنی، تحسین سروری، شہاب الدین، امجد یوسف اور کنول پرشاد کنول وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔ حیدر آباد میں ہی سب سے پہلے محض ایک زبان اردو کی کل ہند کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ یہ کانفرنس نہ صرف حیدر آباد کے لئے بلکہ پورے ہندستان کے اردو داں کے لئے فخر کی بات تھی۔ یہ کامیاب کانفرنس کل پانچ دن تک چلی جس میں اردو سے متعلق تمام اصناف پر زبردست باتیں ہوئی تھیں۔ قاضی عبد الغفار اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے، عابد علی انجمن کے سکریٹری تھے ہی، سلیمان اریب کو بھی سکریٹری کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا اور کرشن چندر نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۴ حیدر آباد کے حالات دور نظام شاہی میں بہت اچھے نہ تھے یہاں پر ترقی پسندوں کو سرکاری مخالفت اور اذیت جھیلنی پڑتی تھی۔ تاہم یہاں کے پر جوش ادیب و شاعر اپنے راستے سے اور اپنی فکر سے منحرف نہیں ہوئے اور انجمن کا نام بدل بدل کر اپنی تحریک چلاتے رہے۔ جیسے ۱۹۴۸ء کے بعد حالات جب زیادہ خراب ہوئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کا نام تبدیل کر کے محفل علم و ادب رکھا گیا اور شاہ غیاث اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ بعد میں اس کا نام بدل کر انجمن عوامی مصنفین ہو گیا اور اب سکریٹری کے فرائض سلیمان اریب کے ذمہ تھے۔ حیدر آباد کے اور دیگر ترقی پسند فکر کے حامل ادیب و شاعر راج بہادر گوڑ، محبوب حسین جگر، جیلانی بانو، عاتق شاہ، راشد آزر، وقار جلیل، ناصر کرنولی، جہاندار افسر، جگر حیدر آبادی اور فکر تونسوی وغیرہ تھے۔

یوں تو کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گونج ۱۹۳۶ء سے ہی موجود تھی کیوں کہ بنگلہ اور انگریزی ادب کے بہت سے ادیب وشاعر اس فکروخیال سے اتفاق رکھتے تھے مگر اردو زبان وادب کا حلقہ زرا دیر میں متاثر ہوا۔ چونکہ بنگال اس دور میں ایک تعلیم یافتہ صوبہ تھا اور جنگ آزادی کی لہر شدومد کے ساتھ جاری تھی اور وہاں کے روشن دماغ ادیب و شاعر اپنے ادب میں آزادی خواہی، ظلم سے بیزاری، انسانی مساوات، غلامی سے نجات کے راگ الاپنا شروع کر چکے تھے۔ اردو میں یہ بات دھیرے دھیرے پیدا ہو رہی تھی۔ پرویز شاہدی، پروفیسر شاہ مقبول، جرم محمد آبادی، شاکر کلکتوی، نواب دہلوی، ابراہم ہوش، ناوک لکھنوی، رضا مظہری، سالک لکھنوی، پروفیسر عباس علی بیخود، شہاب لکھنوی، مضطر حیدری، احسان دربھنگوی، سوز سکندر پوری وغیرہ وغیرہ کلکتہ کی انجمن میں شریک ہوتے تھے۔ مگر یہاں پر یہ انجمن ۱۹۳۷ء کے بعد ہی قائم ہو سکی۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں مرکزی انجمن سے اجازت ملنے پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنگال شاخ قیام میں آئی۔ اس کے صدر پرویز شاہدی، نائب صدر اختر پیامی، جنرل سکریٹری یونس احمد اور سکریٹری نشاط الایمان تھے۔

بمبئی تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرپرست ہی تھی۔ انجمن کا قیام الہ آباد میں ہونے کے بعد اس کا مرکزی دفتر الہ آباد میں ہی قائم کیا گیا پھر یہ مرکز لکھنؤ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچا اور پھر بمبئی میں اس نے اپنے آپ کو مضبوط سے مضبوط تر کیا اور اس دور کے تقریباً سبھی بڑے ادیب وشاعر بمبئی میں بغرض ملازمت وتجارت یکجا ہو گئے۔ فلمی دنیا نے اردو شاعروں اور افسانہ نویسوں کے لئے بہتر مواقع عطا کئے۔ اپٹا کا تعلق بھی زیادہ تر بمبئی سے رہا۔ کیونکہ اداکاری اور اسٹیج کا تعلق بمبئی کی فلمی دنیا سے ہی بنتا اور بگڑتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کا مرکزی دفتر بھی اس وقت بمبئی میں ہی تھا، جہاں سے پارٹی اپنا اردو اخبار جاری کرتی تھی۔ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، مجاز، خواجہ احمد عباس وغیرہ ادارتی کاموں سے لگے ہوئے تھے۔ جوش کا بھی قیام کچھ دنوں بمبئی میں ہی رہا۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، کیف بھوپالی، بلراج ساہنی، وشوامتر عادل، عصمت چغتائی،

راجیندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، مہیندر ناتھ، راجیندر کرشن، شیلیندر، ساغر نظامی، نوشاد، ظ.انصاری، اختر الایمان، ابراہیم جلیس، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، حمید اختر، مدھوسودن، نیاز حیدر، قدوس صہبائی اور رفعت سروش وغیرہ جو کہ ادب اور اپنا دونوں میں اپنا دخل رکھتے تھے اس وقت بمبئی کو روشن کیے ہوئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستیں سجاد ظہیر کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ حمید اختر ان نشستوں کی دلچسپ رپورٹنگ کیا کرتے تھے جو باقاعدگی کے ساتھ بمبئی کے ہفتہ وار نظام میں شائع ہوتی تھیں۔ یہاں کی میٹنگوں میں وہ ادیب و شاعر و فنکار بھی شامل ہوا کرتے تھے جن کا براہ راست تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر ادبی ذوق اور فلمی وسعت کی بنا پر وہ اپنے دوستوں کی باتوں کو سننے کے لئے بنے بھائی کے گھر کی طرف ضرور چل دیا کرتے تھے۔ ان میں جگر مرادآبادی، یگانہ چنگیزی، پطرس بخاری وغیرہ کا نام ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان کا منظر ہے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین اپنی خوبیوں کو کھو بیٹھی۔ کیونکہ تقسیم ہند سے پہلے ساحر لدھیانوی، حمید اختر، ابراہیم جلیس وغیرہ بمبئی چھوڑ کر چلے گئے۔ تحریک کے رہنما سجاد ظہیر کو پاکستان جانا پڑا۔ ہفتہ وار نظام کے مالک وایڈیٹر قدوس صہبائی بھی بمبئی چھوڑ گئے اور نظام ساتھ لیتے گئے۔ اس طرح سے ترقی پسند ادب کا ترجمان اور مشہور ومقبول ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کے چلے جانے سے تحریک کچھ دنوں کے لئے تعطل کا شکار ہوگئی۔ پھر آزادی کے بعد کانگریسی حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو ترچھی نظر سے دیکھنا شروع کردیا۔ اور انجمن کے عہدیداران اور اراکین شک کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے اور انھیں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کو پانچویں کل ہند کانفرنس کے لئے بمبئی میں کوئی جگہ نہ مل سکی جس کی وجہ سے یہ کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی گئی۔ سردار جعفری، ظ.انصاری، بلراج ساہنی وغیرہ گرفتار کیے گئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انجمن وتنظیم پر اشتراکی خیال حاوی ہو رہا تھا اور شدت پسند ترقی پسندوں کو رجعت پرست ثابت کرنے میں ثواب سمجھتے تھے۔ ان ترقی پسندوں کے نزدیک اشتراکی نظریہ سے الگ رہنے والا ادیب وشاعر ترقی پسند فکر کا حامل ہو ہی نہیں

سکتا تھا۔ عصمت چغتائی نے قراۃ العین حیدر کا مذاق اڑایا اور پوم پوم ڈارلنگ کے عنوان سے قراۃ العین حیدر کے فن اور ان کی افسانہ نگاری کو نشانہ ملامت بنایا۔ خواجہ احمد عباس، راجیندر سنگھ بیدی، منٹو وغیرہ کو غیر ترقی پسند ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ فیض بھی ان انتہا پسندوں کے نشانوں سے نہ بچ سکے۔ بہت سے رسالوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور انہیں ترقی پسندی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ رفعت سروش لکھتے ہیں:

"انجمن کا ایک ایسا ہی جلسہ صابو صدیق انسٹیٹیوٹ کے ہال میں منعقد ہوا اور موضوع بحث تھا، اختر الایمان، ظ۔ انصاری، میراجی، مدھوسودن کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ "خیال"۔ انجمن نے سرکلر جاری کر دیا تھا کہ خیال رجعت پرست رسالہ ہے اور اس میں کوئی ترقی پسند ادیب نہ لکھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سردار جعفری کی صدارت میں جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی اور صاحب صدر نے شروع میں ہی اپنی ذاتی حیثیت میں خیال اور اس کے مواد کے خلاف شعلہ بار تقریر کی۔ اور مجمع نے کئی بار تالیاں بجائیں۔ اختر الایمان بھی کچھ کم درجہ کے مقرر نہیں ہیں۔ اختر نے نہایت اثر انگیز جوابی تقریر کی اور کہا کہ ادب پر پارٹی ڈسپلن عائد ہوتا ہے؟ یا ہونا چاہئے؟ ایک یہی ایسی بات ہے جس کا جواب دینا مشکل ہے کیونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور میں کہیں نہیں ہے کہ انجمن کمیونسٹ پارٹی کے مقرر کردہ اصولوں پر چلے گی۔ یہ ادیب کا ذاتی معاملہ ہے کہ وہ کیا سیاسی نظریہ رکھتا ہے۔ چونکہ خواجہ احمد عباس پر پہلے یلغار ہو چکی تھی اس لئے آج وہ بھی اختر الایمان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے بھی بہت عمدہ تقریر کی۔ بہر حال جلسہ بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ختم ہو گیا۔ اختر الایمان نے بعد میں ایک بہت دلچسپ بات کہی کہ میں آج سے

اپنے نام کے ساتھ رجعت پرست لکھا کروں گا۔ دیکھیں کوئی میرا کیا بگاڑتا ہے۔ اختر نے تو یہ بات محض تفریحاً کہی ہوگی مگر واقعہ یہ ہے کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ یوں عدالتیں قائم کر کے ادب نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اور ادب اور ادیب پر اس آسانی سے لیبل لگانا کور ذوقی کا مظاہرہ ہے، ڈنڈے کے زور سے نہ کبھی ادب تخلیق ہوا ہے اور نہ ہو سکے گا۔" [15]

اس درمیاں ادیبوں اور شاعروں کی چشمکیں عروج پر تھیں جس نے ادب اور تنظیم دونوں کو نقصان پہنچایا۔ رفعت سروش نے اس کا بھی بہتر نقشہ پیش کیا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک اقتباس نقل کر دیا جائے۔

"ادیبوں اور شاعروں کے ذاتی اور نجی زندگی کے اختلافات میں بھی انجمن کی ساخت کو بعض دفعہ نقصان پہنچایا۔ ہمارے دو ہر دلعزیز شاعر ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن کسی ادبی معاملے میں نہیں بلکہ بالکل ذاتی معاملے میں دونوں میں چشمک شروع ہو گئی۔ ساحر لدھیانوی نے کیفی کو نیچا دکھانے کے لئے اس کی ادبی شہرت کو داغ دار بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اور ایک بھرپور مضمون رد کیفی میں قلم بند کیا۔ اور مضمون لکھنے سے پہلے لابی تیار کی اور جس دن کوٹھاری مینشن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں وہ مضمون پڑھا اس دن ساحر لدھیانوی کے حامیوں کی بڑی تعداد جلسہ میں موجود تھی۔ علی سردار جعفری جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ ساحر نے ایک رخا مضمون پڑھا، جس میں کیفی کی شاعری کے معائب ہی کو اجاگر کیا گیا تھا اور یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی تھی کہ اول تو کیفی شاعر ہی نہیں ہے، اور اگر ہے تو گھٹیا درجے کا۔ اہل محفل نے مجموعی طور پر مضمون پر واہ واہ کی۔ کچھ بحث ہوئی۔ خاص طور پر صاحب صدر نے جوشیلی تقریر کی۔ اور ان تحریروں کا حوالہ دیا جو ساحر نے اپنے رسائل میں بحیثیت ایڈیٹر کیفی کی تعریف میں لکھی تھی۔ ساحر نے برجستہ کہا وہ میری ذاتی رائے نہیں تھی، کامرشیل نوٹ تھے۔ صاحب صدر ساحر کے مضمون کا طلسم نہ توڑ سکے۔ اس پوری کاروائی کے دوران کیفی اعظمی خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی گمبھیر خاموشی کا مطلب تھا، بکتے رہو۔ میرا کیا بگاڑ سکتے ہو......اور انجمن کی اگلی نشست میں سردار جعفری نے ساحر کی شاعری پر مقالہ پڑھا۔ سردار کا مضمون بھی یک رخا تھا۔ انھوں نے ساحر کی مشہور نظم تاج محل کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نظم میں ہمارے قومی ورثے کا مذاق اڑایا گیا ہے اور یہ رویہ رجعت پرستانہ ہے۔ سردار جعفری نے اس مضمون پر اپنا زور قلم صرف کیا۔ مگر جب مضمون ختم ہو گیا تو ساحر لدھیانوی اپنے پورے قد کے ساتھ اٹھے اور بولے جعفری صاحب اس مضمون سے آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ساحر گھٹیا شاعر ہے، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کیفی اعظمی اچھا شاعر ہے۔ ساحر کے ایک ہی جملے نے سردار جعفری کے مضمون کا اثر زائل کر دیا" [16]

اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر شہروں مثلاً رانچی، گیا، پٹنہ، سورت وغیرہ میں بھی انجمنیں قائم ہوئیں۔ اور وہاں سے ترقی پسند ادب کی ترویج ہوتی رہی۔ ترقی پسند تحریک جیسا کہ کہا جا چکا ہے ادب کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی لگاؤ رکھتی تھی بالواسطہ نہ سہی مگر

اس خطہ میں عوامی رہنمائی ضرور کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تلنگانہ تحریک جو کہ کسانوں اور مزدوروں کی تحریک تھی، اسے انجمن کی پوری حمایت حاصل تھی۔ انجمن کے بہت ہی فعال کارکن مخدوم محی الدین تلنگانہ تحریک کے معروف اور مشہور لیڈر تھے۔ مگر جیسا کہ ترقی پسند تحریک پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ادب میں اور فکر میں پروپیگنڈے کو خاصا دخل دیا ہے، کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے، چونکہ ترقی پسندوں کے نزدیک طبقاتی کشمکش اور تفریق کو لے کر ایک مفروضہ پہلے سے ہی تیار تھا کہ ہر امیر اور دولت مند ظالم اور ہر غریب یا مزدور مظلوم اور فرشتہ صفت ہوتا ہے، ایسے میں ان ترقی پسندوں کے نزدیک یہ پروپیگنڈا ضروری تھا۔ ہم اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔ جیسا کہ تحریک کے شروع میں ہی لکھنؤ کے مشہور شاعر اور قدیم طرز فکر کے رسیا نواب جعفر علی خان اثر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی فکر پر انگلی اٹھاتے ہوئے سوال قائم کیا تھا کہ یہ لوگ اشتراکیت کے نشہ میں ایک مفروضہ قائم کر کے اپنے منصوبے کو آگے بڑھا رہے ہیں اور اس کا جواب سجاد ظہیر نے سراج مبین کے نام سے دیا تھا۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ آخر تک ترقی پسندوں کے یہاں یہ مفروضہ قائم رہا۔ حد تو یہ تھی کہ ہندستان کے دور دراز کے شہروں میں بیٹھا ہوا ادیب و شاعر بھی ماسکو کی گلیوں کی تعریف اس انداز میں کرتا تھا جیسے اس نے اپنی ساری زندگی انھیں گلیوں میں بسر کی ہو۔ یہ انتہا پسندی تھی۔ مگر اس وقت یہی انتہا پسندی ترقی پسندی کی ضامن تھی۔

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان سب عیوب کے باوجود انجمن ترقی پسند مصنفین نے ہندستانی سماج اور ہندستانی فکر و شعور کو ایک نئی سمت، ایک نیا وژن عطا کیا۔ ہمیں تحریک کے ان حسین پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جس کے زیر اثر ہمارا ادب ہماری زندگی سے جڑ سکا۔ ہمارے احساسات، ارد گرد کے واقعات، دوسروں کی مصیبت و تکالیف، غریبوں اور کمزوروں کی مجبوریاں، مظلوموں کا بیجا تشدد اور سماجی و تہذیبی قدروں کے فقدان کو صفحہ قرطاس پر اتارا۔ اسی ادب نے عوام کو اور باشعور قاری کو اچھے اور برے

میں، افادی اور غیر افادی میں تمیز کرنا سکھایا اور اسی تحریک نے عوام کو اپنا حق پانے کے لئے، ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لئے صف آرا ہونے کی قوت بخشی۔ غیر ترقی پسند ادب غلط نہ سہی مگر وہ ماضی کے لئے مشعل بھی نہیں بن سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے غیر ترقی پسندوں کے لئے ایک نئی اصطلاح رجعت پرست ایجاد کی۔ جس کے معنی پیچھے کی طرف دیکھنے والا ہے۔ مگر ترقی پسندوں نے اسے برے معنی میں استعمال کیا یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظالموں اور سرمایہ داروں کے زیر سایہ رہنے والے ادیبوں کے لئے استعمال کیا۔ مگر اس سے ہم ہر اس ادب کی بیخ کنی کر دیتے ہیں۔ جس میں نہ کوئی غلط بات ہوتی ہے، نہ فحاشی ہوتی ہے، ظلم کی حمایت ہوتی ہے اور نہ ہی اخلاقی پستی۔ ایسے ادب میں کبھی کبھی محض لطف حظ کی باتیں ہوتی ہیں، پریشان زندگی سے کچھ لمحے سکون کی تلاش میں ماورائی کہانیاں ہوتی ہیں یا پھر حسن عشق کی داستان۔ ہم انھیں ترقی پسند ادب بھلے ہی نہ کہیں مگر ان کے وجود کو سرے سے نکار دینا اچھی بات نہیں۔ بہت سارے ترقی پسند ناقدوں نے اس رمز کو سمجھا بھی تھا اور انھوں نے انتہا پسندوں اور متشدد تخلیق کاروں کو اس غلط رجحان کی طرف سے روکا بھی۔ ترقی پسند تحریک کی ادبی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہم پائیں گے کہ معدودے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر ادیب و شاعر اعتدال پسند تھے۔ سماجی قدروں کی حفاظت کرنے والے تھے۔ انسانیت اور اخوت کے علمبردار تھے۔ پس ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ ادب محض لطف وسکون کے لئے نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں فلسفیانہ اور معاشرانہ باتیں بھی ہوں جن سے ہمارے عوام ان باتوں کی تہہ تک پہنچ سکیں جہاں تک ان کی رسائی بغیر علم و آگہی کے ممکن نہیں۔ دراصل جب ہم ترقی پسند ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے تحریک کے سرکردہ اور سرگرم ادیب و شاعر کی تخلیقات ہی ہوتی ہیں اور ایسے ادیب و شاعر اپنے علم و عمل کے زعم میں انتہا پسند بھی ہو سکتے ہیں۔

تاہم کلی طور پر ترقی پسند تحریک کو دیکھا جائے، اس کی عملی و علمی خدمات پر غور کیا

جائے تو ہم باوجود کچھ خامیوں کے زیادہ تر خوبیاں ہی خوبیاں پائیں گے، جس نے ہندستانی معاشرے، طبقاتی نظام، ہندستانی معشیت اور سیاسی شعور کو جلا بخشی اور ادب کی ایک بہتر سمت متعین کردی۔

حواشی

۱۔ پریم چند کے خطبہ سے ماخوذ
۲۔ اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از منظر اعظمی صفحہ ۲۶۸
۳۔ پہلی کل ہند کانفرنس میں منظور اعلان نامہ سے ماخوذ
۴۔ روشنائی از سجاد ظہیر ایڈیشن ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۳۸۔۱۳۹
۵۔ روشنائی از سجاد ظہیر ایڈیشن ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۳۹
۶۔ سراج مبین از سجاد ظہیر مشمولہ نیا ادب اور کلیم ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۶
۷۔ سراج مبین از سجاد ظہیر مشمولہ نیا ادب اور کلیم ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۴
۸۔ ادب زندگی اور سماج از محمد حسن ۱۹۳۹ء کا بہترین ادب ناشر مکتبہ شاہراہ صفحہ ۶۵
۹۔ ادب زندگی اور سماج از محمد حسن ۱۹۳۹ء کا بہترین ادب ناشر مکتبہ شاہراہ صفحہ ۶۰
۱۰۔ ترقی پسندی از ڈاکٹر سلامت اللہ منتخب ادب (مرتب احتشام حسین، غلام ربانی تاباں)
حالی پبلشنگ ہاؤس ص ۶۱۔۵۹
۱۱۔ ترقی پسند تحریک اور علی گڑھ از رفیق احمد نقوی مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۲۳۰
۱۲۔ ترقی پسند تحریک اور علی گڑھ از رفیق احمد نقوی مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۲۳۲
۱۳۔ ترقی پسند تحریک اور الہ آباد از سید محمد عقیل رضوی مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۲۶۱
۱۴۔ حیدرآباد اور ترقی پسند تحریک از سلیمان اطہر جاوید مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۲۷۰
۱۵۔ ترقی پسند تحریک اور بمبئی از رفعت سروش مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۳۰۵۔۳۰۴
۱۶۔ ترقی پسند تحریک اور بمبئی از رفعت سروش مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر صفحہ ۳۰۶۔۳۰۵

تعارف

نام	:	عبدالقیوم شمسی
والد کا نام	:	جناب شبیر حسن شمسی
والدہ کا نام	:	محترمہ صابرہ جہاں
تاریخ پیدائش	:	۸؍جولائی ۱۹۸۰ء
مقام پیدائش	:	مچھلی شہر، ضلع جونپور
تعلیم	:	پی ایچ ڈی (اردو) الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
ملازمت	:	لکچرر، شعبۂ اردو محمد حسن پوسٹ گریجویٹ کالج، جونپور
پتہ	:	قضیانہ (نئی بستی) مچھلی شہر، ضلع جونپور

maablib.org

TARAQQUI PASAND TAHREEK KI TAREEKH

By

Dr. Abdul Qayoum Shamsi

Cover Designed by JAVED NAZAR Allahabad Contact